EDWIN van de HAAR's
HUMAN NATURE & WORLD AFFAIRS

کلاسیکی لبرل ازم اور نظریہ بین الاقوامی تعلقات کا تعارف

انسانی فطرت اور عالمی امور



مؤلف | ایڈوِن وان ڈِی ہار

مترجم | محمد سلیمان

بنامِ خداوندِ رحمان و رحیم

انسانی فطرت اور عالمی امور

کلاسیکی لبرل ازم اور نظریۂ بین الاقوامی تعلقات کا تعارف

مؤلف | ایڈوِن وان ڈِی ہار ◆ مترجم | محمد سلیمان

Whetstone FREEDOM FUND
iea Institute of Economic Affairs
NATIONAL INFLUENCERS

URDU TRANSLATION OF *EDWIN van de HAAR's*

HUMAN NATURE & WORLD AFFAIRS

AN INTRODUCTION TO CLASSICAL LIBERALISM AND INTERNATIONAL RELATIONS THEORY

انسانی فطرت اور عالمی امور

کلاسیکی لبرل ازم اور نظریۂ بین الاقوامی تعلقات کا تعارف

مؤلف	ایڈوِن وان ڈِی ہار
مترجم	محمد سلیمان
ناشر	نیشنل اِنفلوونسرز
سنِ اشاعت	ستمبر ۲۰۲۶ء
تعداد	۱۰۰۰
پریس	ہنفکر سکرپٹو سٹوڈیو

ISBN 978-627-7608-09-5

9 786277 608095

Crafted, Published & Printed by
HUNFIKAR SCRIPTO STUDIO
+92 337 9594333
hunfikar@gmail.com
HUNFIKAR

HUNFIKAR
Scripto Studio

نیشنل اِنفلوونسرز: مختصر تعارف

نیشنل اِنفلوونسرز ایک آزاد اور غیر جانب دار پبلک پالیسی تھنک ٹینک ہے، جو پاکستان میں انفرادی آزادی، محدود حکومت، قانون کی حکمرانی، آزاد منڈی اور مضبوط اداروں کے فروغ کے لیے کام کرتا ہے۔ ادارہ تحقیق، پالیسی مکالمے، اشاعت، نوجوانوں کی فکری تربیت اور عوامی آگاہی کے ذریعے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کا خواہاں ہے جہاں افراد کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار، معاشی ترقی اور باوقار زندگی کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہوں۔

نیشنل اِنفلوونسرز کا یقین ہے کہ پائیدار ترقی، امن اور خوش حالی کی بنیاد انفرادی آزادی، ذمہ دار قیادت، مؤثر اداروں اور قانون کی بالادستی پر استوار ہوتی ہے۔ اسی وژن کے تحت ادارہ پاکستان میں علمی و فکری مکالمے کو فروغ دینے اور نئی نسل کو معاصر سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل کے آزادانہ اور تنقیدی مطالعے کی جانب راغب کرنے کے لیے کوشاں ہے۔

انسانی فطرت اور عالمی امور

کلاسیکی لبرل ازم اور نظریۂ بین الاقوامی تعلقات کا تعارف

مؤلف | ایڈوِن وان ڈِی ہار ◆ مترجم | محمد سلیمان

فہرست

- شکریہ(Acknowledgements) .... اَ
- خلاصہ.. د
- کلاسیکی لبرل ازم .... ہ

حصہ اول: تعارف

1. پہلا باب: تعارف(Introduction) 18
2. دوسرا باب: لبرل ازم(اور قدامت پسندی).. 28
3. تیسرا باب: اسکاٹش روشن خیالی(Scottish Enlightenment): ڈیوڈ ہیوم اور ایڈم اسمتھ . 43
4. چوتھا باب: آسٹرین مکتبِ فکر: لڈوگ وون میزس اور ایف۔اے۔ہائیک 62

حصہ دوم: بنیادی اجزا

5. پانچوں باب: افراد: انسانی فطرت، فطری اور انسانی حقوق 81
6. چھٹا باب: گروہ: اقوام، ریاستیں، خود مختاری اور ہجرت 93
7. ساتواں باب: تشدد: طاقت کا توازن، جنگ اور عسکری مداخلت 112
8. آٹھواں باب: اصول: بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی تنظیمیں 129
9. نواں باب: معاشیات: تجارت، عالمگیریت اور ترقیاتی امداد 139

حصہ سوم: بین الاقوامی تعلقات کا نظریہ

10. دسواں باب: بین الاقوامی تعلقات (IR) کے لبرل نظریات 157
11. گیارھواں باب: کلاسیکی لبرل ازم، بین الاقوامی تعلقات کا نظریہ اور خارجہ پالیسی 176
12. بارھواں باب: لبر ٹیر ینز اور بین الاقوامی تعلقات(IR) 195
13. تیرھواں باب: خلاصہ 215

شکریہ(Acknowledgements)

اس کتاب کو تحریر کرنا میرے لیے ایک نہایت خوشگوار تجربہ رہا۔اس نے مجھے یہ موقع فراہم کیا کہ میں اپنی اُن دلائل کو دوبارہ تازہ کروں، ان کا دائرہ وسیع کروں اور انہیں بہتر بناؤں جو میں نے اپنی سابقہ تصانیف "Classical Liberalism and International Theory: Hume, Smith, Mises and Hayek (2009)" اور "Degrees of Freedom: Liberal Political Philosophy and Ideology (2015)" میں پیش کیے تھے۔ بعض نئے خیالات دیگر علمی کاموں سے ماخوذ ہیں، جبکہ کچھ خاص اسی کتاب کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ چونکہ یہ کتاب بطور تعارف لکھی گئی ہے، اس کا مخاطب حلقہ زیادہ وسیع ہے، جس کی وجہ سے اس کا لہجہ، حوالہ جاتی انداز اور اسلوب سابقہ کتب سے مختلف ہے۔

اگرچہ ''میں اعزاز محسوس کرتا ہوں'' جیسا جملہ اکثر بے جا استعمال ہوتا ہے، لیکن اس موقع پر اس کے حقیقی معنی سے انکار ممکن نہیں۔ جب میری ملاقات لارڈ ہیرس سے 1996ء کے موسمِ خزاں میں ہوئی، جب انہوں نے لندن اسکول آف اکنامکس میں ہائیک سوسائٹی سے خطاب کیا اور بعد ازاں مجھے اُس سال کے وِنکاٹ لیکچر میں شرکت کی دعوت دی، تب سے Institute of Economic Affairs (IEA) میرے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ خاص طور پر اس کی

طویل تاریخ، جس میں متعدد ممتاز مصنفین کی شاندار تصنیفی خدمات شامل ہیں جن کے کام کی میں قدر کرتا ہوں۔ لہٰذا واقعی، میرے لیے یہ ایک اعزاز ہے کہ میں بھی اس ادارے کے لیے ایک معمولی مگر بامعنی حصہ ڈال رہا ہوں۔

میں پروفیسر لارڈ سید کمال، جو IEA کے سابق اکیڈمک اور ریسرچ ڈائریکٹر رہے ہیں، کا نہایت شکر گزار ہوں جنہوں نے کلاسیکی لبرل ازم اور بین الاقوامی امور میں میری دلچسپی کو سراہا۔ انہوں نے مجھے IEA کے مختلف پلیٹ فارمز کے لیے لکھنے کی دعوت دی، اس کتاب کا کمیشن دیا اور اس کی تفصیلی تدوین بھی کی۔ ان کے جانشین پروفیسر جیمز فورڈر نے اس منصوبے کو نہایت جوش و جذبے کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا، جس کے لیے میں ان کا بھی مشکور ہوں۔ اسی طرح ان تمام افراد کا بھی شکریہ جنہوں نے اس کتاب کی تیاری اور اس کی ابلاغی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔

میں ان دو نامعلوم (anonymous) ریویورز کا بھی شکر گزار ہوں جن کی تجاویز نے یقیناً کتاب کے معیار کو بہتر بنایا۔ باقی رہ جانے والی تمام غلطیاں یقیناً میری اپنی ذمہ داری ہیں۔

فلاور شیپر میری محبت اور بھرپور حمایت کا ایک اہم ذریعہ رہی ہیں۔ ہم نے مل کر ایسے نسبتاً مثالی حالات پیدا کیے جن میں کام، مطالعہ اور تفریح کو ساتھ ساتھ جاری رکھا جا سکا۔ یہ واقعی ایک نعمت ہے، اور میں ان کی حوصلہ افزائی اور تعاون کے لیے تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

یہ کتاب ڈاکٹر نِگل ایشفورڈ (Institute of Humane Studies, IHS) کو منسوب ہے، جو جارج میسن یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ ہماری ملاقات 2005 میں چارلٹس وِل کی یونیورسٹی آف ورجینیا میں IHS گریجویٹ سمر سیمینار کے دوران ہوئی۔ نِگل کو ہمیشہ سے کلاسیکی لبرل ازم اور بین الاقوامی تعلقات میں گہری دلچسپی رہی ہے، اور وہ ایک نہایت خوش مزاج اور ملنسار شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی بدولت مجھے اپنے پی ایچ ڈی تھیسز کے دوران IHS کے متعدد پروگراموں میں شرکت کا موقع ملا، اور تب سے وہ مسلسل اپنی وسیع نیٹ ورکنگ کے ذریعے مجھے ایسے افراد سے جوڑتے رہے ہیں جو بین الاقوامی تعلقات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اسی لیے، نِگل کی

شاندار اور قابل قدر خدمات کے احترام میں، میری خواہش ہے کہ یہ کتاب طلبہ اور محققین میں کلاسیکی لبرل بین الاقوامی سیاسی نظریے کے میدان میں کام کرنے کا شوق پیدا کرے۔

شکریہ!

نِگل

خلاصہ

یہ کتاب بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے کلاسیکی لبرل نظریہ پیش کرتی ہے۔ یہ نظریہ نیا وضع کردہ نہیں ہے، بلکہ اسے کلاسیکی لبرل مفکرین خصوصاً ڈیوڈ ہیوم، ایڈم اسمتھ، لڈوِگ وون مزِس اور ایف اے ہائیک کی تحریروں اور افکار سے اخذ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا اگرچہ کلاسیکی لبرل نظریے کے مختلف اجزا ہمیشہ سے موجود رہے ہیں، لیکن وہ ان مفکرین کی تحریروں میں مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے تھے۔ بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں ان کے افکار کبھی ایک مربوط اور جامع صورت میں پیش نہیں کیے گئے، جس کے نتیجے میں ان کی متعدد غلط تشریحات سامنے آئیں۔

کلاسیکی لبرل ازم

بین الاقوامی تعلقات کے کلاسیکی لبرل نظریے کو داخلی سیاست کے بارے میں کلاسیکی لبرل افکار کے منطقی تسلسل کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ لبرل ازم کی دیگر اقسام سے واضح طور پر مختلف ہے۔ اس نظریے کو مختلف بنیادی اجزا اور متعلقہ تصورات کے ذریعے پیش کیا جائے گا، جس میں جزوی طور پر مائیکل فریڈن (1996) کے طریقۂ کار سے رہنمائی لی گئی ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کے کلاسیکی لبرل نظریے کے بنیادی نکات درج ذیل ہیں:

- انسانی فطرت کے بارے میں ایک حقیقت پسندانہ تصور اس نظریے کی بنیاد ہے، جو افراد کی سماجی فطرت کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے جھگڑنے، لڑنے اور تشدد کے رجحان کو بھی مانتا ہے۔ انسانی فطرت کے بارے میں یہ تصور بین الاقوامی تعلقات کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ عالمی سیاست مکمل طور پر انسانی سرگرمیوں پر مبنی ہے۔
- جنگ اور تشدد افسوسناک مگر ناگزیر بین الاقوامی حقیقتیں ہیں۔ کلاسیکی لبرل مفکرین کا مقصد انہیں ختم کرنا نہیں بلکہ ان کے ساتھ نمٹنے کے طریقے تلاش کرنا ہے۔
- (قوم) ریاست بین الاقوامی تعلقات میں مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ ریاستی خودمختاری کا احترام ضروری ہے۔ صرف غیر معمولی حالات میں ہی اتحاد یا وفاق کی صورت میں محدود انحراف کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔

- عالمی سیاست میں مفادات کی مکمل ہم آہنگی (harmony of interests) موجود نہیں ہے۔ ریاستیں ایک بین الاقوامی معاشرہ تشکیل دے سکتی ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ سیکیورٹی کے مسئلے (security dilemma) کا سامنا کرتی رہیں گی۔
- طاقت کا توازن (balance of power) بین الاقوامی سطح پر ایک خود کار اور خود بخود وجود میں آنے والا نظم (spontaneous order) ہے۔
- منصفانہ جنگ (just war) کے اصول قابلِ اطلاق ہیں، تاہم فوجی مداخلت کو جواز دینے والے مواقع انتہائی محدود ہیں، اور زیادہ تر صرف نسل کشی (genocide) کو روکنے یا ختم کرنے تک محدود ہیں۔
- ایک طرف بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی ادارے مفید ہیں، اور بین الاقوامی ذمہ داریاں اہم ہیں اور ان کی پاسداری ضروری ہے (pacta sunt servanda)۔ لیکن دوسری طرف یہ قوانین اور ادارے انفرادی آزادی کے لیے خطرات بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ لہٰذا کلاسیکی لبرل مفکرین ان دونوں کی محدود حمایت کرتے ہیں۔
- بین الاقوامی سطح پر معیاری معاشی پالیسی آزاد تجارت اور عالمگیریت (globalization) پر مبنی ہے، جبکہ کلاسیکی لبرل مفکرین حکومتی ترقیاتی امداد (development aid) کے بارے میں شکوک رکھتے ہیں، کیونکہ یہ ٹیکس دہندگان کے پیسے سے فراہم کی جاتی ہے۔
- اگرچہ آزاد تجارت ممالک کے درمیان تعلقات کو بہتر بناتی ہے، لیکن یہ بذاتِ خود امن قائم نہیں کرتی۔ یہ نہ انسانی فطرت کو تبدیل کر سکتی ہے اور نہ ہی جنگ کی دیگر بنیادی وجوہات کو ختم کر سکتی ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کے لبرل نظریات میں فرق

بین الاقوامی تعلقات کے کلاسیکی لبرل نظریے اور موجودہ لبرل IR نظریات کے درمیان نمایاں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اہم فرق درج ذیل جدول کی صورت میں پیش کیے جا سکتے ہیں:

لبرل IR نظریات	کلاسیکی لبرل IR نظریہ
عالمی امن قابلِ حصول ہے، اس یقین کے ساتھ کہ انسان اتنے عقل مند ہیں کہ جنگ اور تصادم پر قابو پا سکتے ہیں۔	جنگ اور تصادم بین الاقوامی تعلقات کی مستقل اور لازمی خصوصیات ہیں، جو انسانی فطرت کے حقیقت پسندانہ تصور پر مبنی ہیں۔
قومی ریاست کو عالمی معاملات میں ایک مسئلہ خیز کردار سمجھا جاتا ہے۔	قومی ریاست بین الاقوامی تعلقات میں بنیادی اور فطری اکائی ہے۔
طاقت کا توازن (balance of power) مسئلہ پیدا کرتا ہے اور جنگ کا سبب بنتا ہے۔	طاقت کا توازن بین الاقوامی سطح پر ایک خودکار نظم پیدا کرنے والا (spontaneous ordering mechanism) عمل ہے، جو کسی حد تک بین الاقوامی نظم و استحکام کو فروغ دیتا ہے۔
انسانی حقوق کا ایک وسیع اور جامع مجموعہ دفاع کے قابل سمجھا جاتا ہے۔	صرف کلاسیکی اور بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ پر زور دیا جاتا ہے۔
داخلی ادارہ جاتی ڈھانچے، خصوصاً جمہوریت (جمہوری امن نظریہ)،	داخلی سیاسی ڈھانچوں کے ذریعے جنگ اور تصادم کے خاتمے کے امکان کے بارے میں شدید شکوک پائے جاتے ہیں۔

کے ذریعے بین الاقوامی امن کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔	
بین الحکومتی اور غیر حکومتی تنظیمیں، بین الاقوامی نظامات اور قوانین کو طاقت کی سیاست کے اثرات کو ختم یا کم کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔	**بین الاقوامی قانون، ادارے اور تنظیمیں اہم ہیں مگر ان کا کردار محدود اور زیادہ تر عملی (functional) ہونا چاہیے۔ یہ اکثر انفرادی آزادی کے لیے خطرہ بھی بن سکتے ہیں۔**
بین الاقوامی تجارت سے امن کے فروغ کی توقع کی جاتی ہے۔	**تجارت اور امن کے درمیان کوئی لازمی یا ضروری تعلق نہیں سمجھا جاتا۔**
فوجی مداخلت اور جمہوریت کے فروغ کی نسبتاً وسیع حمایت موجود ہوتی ہے۔	**فوجی مداخلت صرف انتہائی غیر معمولی حالات، مثلاً نسل کشی(genocide) ، میں قابل قبول ہے، جبکہ جمہوریت کی ترقی (democracy promotion) کو تقریباً کبھی مؤثر نہیں سمجھا جاتا۔**

حقیقت پسندی (Realism) سے اختلافات

کلاسیکی لبرل ازم بین الاقوامی تعلقات (IR) میں کوئی خالص "حقیقت پسند" (realist) نظریہ نہیں ہے۔ حقیقت پسندی اور کلاسیکی لبرل ازم میں کچھ مشترک نکات ضرور پائے جاتے ہیں، جیسے عالمی سیاست میں قومی ریاست کا مرکزی کردار، طاقت کے توازن (balance of power) کی اہمیت، اور یہ تسلیم کرنا کہ جنگ بعض اوقات ناگزیر ہوسکتی ہے۔ تاہم، ان دونوں کے درمیان بنیادی اختلافات درج ذیل ہیں:

- کلاسیکی لبرل ازم کے مطابق بین الاقوامی نظم (international order) کے امکان کے بارے میں زیادہ امید پائی جاتی ہے، جبکہ حقیقت پسند نظریہ نسبتاً زیادہ مایوس کن اور طاقت کے مقابلے پر مبنی ہوتا ہے۔ کلاسیکی لبرلز عالمی سیاست میں اخلاقی اصولوں اور معیارات کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔
- کلاسیکی لبرل ازم ریاست کے مفاد کے بجائے فرد کی آزادی (individual liberty) کو زیادہ اہم سمجھتا ہے، جبکہ حقیقت پسندی میں ریاستی مفادات کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔
- کلاسیکی لبرلز بڑی طاقتوں (great powers) کے ذریعے عالمی نظام کے نظم و نسق کے تصور کے بارے میں کم آمادہ ہوتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک تمام ریاستوں کی خودمختاری (sovereignty) کا تحفظ ضروری ہے۔ بین الاقوامی قانون اور ادارے محدود ہونے چاہئیں، مگر انہیں مکمل طور پر رد نہیں کیا جا سکتا۔
- کلاسیکی لبرل ازم عالمی سیاست کو مکمل انارکی (anarchy) کے طور پر نہیں دیکھتا، بلکہ اسے ریاستوں کے ایک "انارکی پر مبنی معاشرے" (anarchical society of states) کے طور پر سمجھتا ہے۔ کیونکہ مکمل عالمی انارکی کا نظام غیر یقینی ہوتا ہے اور کلاسیکی لبرل اصولوں جیسے آزاد تجارت، عالمگیریت، منصفانہ جنگ کے قواعد، اور محدود مگر مؤثر بین الاقوامی قانون کے لیے کم سازگار ہوتا ہے۔
- کلاسیکی لبرلز اصولی طور پر صرف محدود اور مخصوص نوعیت کی بین الاقوامی تنظیموں کی حمایت کرتے ہیں، یعنی ایسی تنظیمیں جو واضح اور عملی (functional) کردار رکھتی ہوں۔
- کلاسیکی لبرل ازم ترقیاتی امداد (development aid) کے بارے میں شکوک رکھتا ہے، کیونکہ یہ اکثر سیاسی طاقت کے مقاصد کے لیے استعمال کی جاتی ہے، تاہم وہ

افراد کی جانب سے دی جانے والی نجی امداد اور غیر ریاستی فلاحی اقدامات کی زیادہ حمایت کرتا ہے۔

آزادی پسندانہ نظریات (Libertarianism) سے اختلافات

کلاسیکی لبرل ازم اور آزادی پسندانہ (libertarian) نظریات میں کئی مشترک پہلو پائے جاتے ہیں، جیسے فرد کی آزادی کو ترجیح دینا، آزاد تجارت اور عالمگیریت کی حمایت کرنا، اور جنگ کے دوران ریاست کے غیر ضروری پھیلاؤ پر تشویش رکھنا۔ تاہم، بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے ان دونوں میں اہم فرق موجود ہیں:

- کلاسیکی لبرل ازم بین الاقوامی سیاست میں قومی ریاست کے کردار، طاقت کے توازن (balance of power)، اور بین الاقوامی تعلقات میں محدود مگر حقیقی امن کے امکانات کو اہمیت دیتا ہے۔
- کلاسیکی لبرلز "امریکی سلطنت" (American empire) یا کسی بھی بڑی طاقت کے عالمی تسلط کو روکنے کے معاملے پر اتنے مرکزی یا یک رخے طور پر فکر مند نہیں ہوتے جتنا کہ بعض آزادی پسند نظریات میں دیکھا جاتا ہے۔
- کلاسیکی لبرل ازم مکمل طور پر کھلی امیگریشن (open immigration) کی حمایت نہیں کرتا، اور یہ بھی نہیں مانتا کہ تجارت اور امن کے درمیان کوئی لازمی اور سیدھا تعلق موجود ہے۔
- کلاسیکی لبرلز گوریلا جنگ (guerrilla warfare) یا قومی دفاع کی نجکاری (privatisation of national defence) کے نظریات کو قبول نہیں کرتے۔

- کلاسیکی لبرل مفکرین کے نزدیک بین الاقوامی تعلقات میں آزادی پسندانہ (libertarian)سوچ میں بعض اوقات ایک تنہائی پسندی (isolationism)کا رجحان پایا جاتا ہے، خاص طور پر یکطرفہ تنہائی پسندی یا غیر جانبداری (neutrality) کی صورت میں۔

جدولیں

جدول1: لبرل ازم کی مورفولوجی (ساختی درجہ بندی)—— صفحہ 31
جدول2: قدامت پسندی کی مورفولوجی (ساختی درجہ بندی)—— صفحہ 41
جدول3: کلاسیکی لبرل بین الاقوامی نظریے کی مورفولوجی (ساختی درجہ بندی)—— صفحہ 155
جدول4: لبرل اور کلاسیکی لبرل بین الاقوامی تعلقات کے نظریات کے درمیان اختلافات—— صفحہ 177

حصہ اول: تعارف

پہلا باب

تعارف (Introduction)

وبائیں، کہیں جنگ، کہیں یوکرین اور دیگر خطوں میں جاری تنازعات، بین الاقوامی تجارت، بریگزٹ، بڑی طاقتوں کے درمیان طاقت کی کشمکش، ترقیاتی امداد، بین الاقوامی ادارے، یورپی یونین، اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل، جوہری اور کیمیائی ہتھیار، سائبر جنگ، سرحدی تنازعات، اور بین الاقوامی ماحولیاتی وموسمیاتی پالیسیاں: یہ سب وہ موضوعات ہیں جو ہر روز، دنیا بھر میں، آن لائن اور آف لائن میڈیا میں زیر بحث رہتے ہیں۔

کلاسیکی لبرلز ان مسائل کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟ بظاہر بہت کم۔ جہاں لبرل انٹرنیشنلزم (Liberal Internationalism) اور لبرل انسٹیٹیوشنلزم (Liberal Institutionalism) کے ماہرین، اور اسی طرح حقیقت پسند (Realist)، تعمیری (Constructivist)، مارکسی (Marxist)، تنقیدی نظریہ (Critical Theory)، فیمینسٹ (Feminist) اور دیگر مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے اسکالرز مسلسل خارجہ امور پر تبصرہ کرتے رہتے ہیں، وہاں کلاسیکی لبرلز کی آواز نسبتاً کم سنائی دیتی ہے۔

اگرچہ کبھی کبھار کوئی علمی مضمون یا زیادہ تر امریکی حالاتِ حاضرہ پر کلاسیکی لبرل مصنفین کی رائے سامنے آجاتی ہے، لیکن عمومی تاثر یہ ہے کہ بہت سے کلاسیکی لبرلز سمجھتے ہیں کہ اگر آزاد تجارت، عالمگیریت اور نسبتاً تنہائی پسند (isolationist) خارجہ پالیسیاں اختیار کرلی جائیں تو سب کچھ

ٹھیک ہو جائے گا۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک، چاہے وہ لبرل روایات کے اندر ہوں یا باہر، یہ رویہ انہیں بین الاقوامی تعلقات کے سنجیدہ مباحث میں ایک قابلِ اعتبار فریق کے طور پر تسلیم کیے جانے سے محروم کر دیتا ہے۔

یہ ایک تشویشناک صورتِ حال ہے، کیونکہ اس کے نتیجے میں یہ کوتاہیاں درج ذیل نتائج پیدا کرتی ہیں:

- کلاسیکی لبرل مفکرین کے بنیادی افکار کی غلط یا بگڑی ہوئی تصویر پیش کی جاتی ہے؛
- ایسے بیانات دیے جاتے ہیں جو کلاسیکی لبرل مصنفین کے کام کے چند منتخب اور آدھی حصوں پر مبنی ہوتے ہیں، اور ان کے مکمل مؤقف کی نمائندگی نہیں کرتے؛
- عالمی سیاست کے تناظر میں کلاسیکی لبرل ازم کے بارے میں غلط دعوے کیے جاتے ہیں، بعض اوقات خود کلاسیکی لبرلز کی طرف سے بھی؛
- اکیڈمک لبرل نظریات میں کلاسیکی لبرل ازم کی عدم موجودگی، جس کے نتیجے میں لبرل روایت کی ایک نامکمل تصویر سامنے آتی ہے؛
- طلبہ کی نسلیں ایسی تعلیم حاصل کرتی ہیں جس میں انہیں یہ بنیادی شعور تک نہیں دیا جاتا کہ کلاسیکی لبرل ازم صرف بین الاقوامی معیشت تک محدود نہیں بلکہ بین الاقوامی تعلقات (international relations) کا بھی احاطہ کرتا ہے، جس کے نتیجے میں کلاسیکی لبرل افکار ایک کم متعلقہ (less relevant) نظریے کے طور پر دکھائی دیتے ہیں، خاص طور پر ایک ایسے دور میں جب دنیا تیزی سے عالمگیریت (globalization) کی طرف بڑھ رہی ہے۔

اس نظر اندازی یا غلط فہمیوں (oversight) کو دور کرنا ضروری ہے۔ یہ کتاب عالمی سیاست کو سمجھنے کے لیے ایک کلاسیکی لبرل زاویۂ نظر فراہم کرتی ہے۔ یہ بین الاقوامی امور کے تجزیے کے لیے ایک کلاسیکی لبرل فریم ورک پیش کرتی ہے۔ بہت سے لوگوں کے لیے، بشمول بین الاقوامی تعلقات

کے نظریے کے ماہرین کے، یہ تصور نیا محسوس ہو سکتا ہے، کیونکہ انہیں شاید یہ اندازہ نہیں کہ ایسا کوئی مربوط کلاسیکی لبرل بین الاقوامی نظریہ موجود ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ ایسا نظریاتی فریم ورک موجود رہا ہے اور ہمیشہ سے موجود ہے، جس کی جڑیں اٹھارویں صدی میں شروع ہونے والی کلاسیکی لبرل روایات میں پیوست ہیں۔

فلپ کنلف (Philip Cunliffe) اس حوالے سے ایک نمایاں استثنا ہیں، جو اپنی کتاب The New Twenty Years' Crisis (2020) میں تسلیم کرتے ہیں کہ بین الاقوامی امور میں لبرل ازم کی جڑیں شاید ڈچ انقلاب (Dutch Revolt) کے دور (1568–1648) تک بھی پہنچتی ہیں، لیکن یقینی طور پر یہ سترہویں صدی کی "سات سالہ جنگ" (Seven Years' War, 1756–1763) تک واضح ہو جاتی ہیں، جب برطانیہ نے فرانس کی مطلق العنان بادشاہت (absolutism) کے مقابلے میں آزادی کے دفاع کا دعویٰ کیا تھا، اور ہیوم نے یہ خیال پیش کیا تھا کہ طاقت کا توازن آزادی کے تحفظ کے لیے ضروری شرط ہے۔

کلاسیکی لبرلز عالمی سیاست کو دیگر لبرل مفکرین کے مقابلے میں مختلف انداز سے دیکھتے ہیں، اور تو در کنار قدامت پسندوں، سماجی جمہوریت پسندوں، کرسچن ڈیموکریٹس، سوشلسٹس یا کمیونسٹس سے بھی ان کا نقطۂ نظر مختلف ہے۔ ان اختلافات کو اس کتاب میں واضح کیا جائے گا، کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں نہ صرف وسیع لبرل روایات کے اندر بلکہ اکیڈمک دنیا اور اس سے باہر بھی زیادہ تر الجھن پیدا ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر بعض بین الاقوامی تعلقات (IR) کی کتابوں میں "کلاسیکی لبرل انٹر نیشنل ازم" کا ذکر کیا جاتا ہے، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ دو عالمی جنگوں کے بعد اپنی اہمیت کھو بیٹھا، لیکن در حقیقت یہاں جس چیز کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے وہ کلاسیکی لبرل انٹر نیشنل ازم کا ایک

مخصوص تصور ہے، نہ کہ خود کلاسیکی لبرل ازم کا بین الاقوامی پہلو(Jönsson 2018) ۔اس موضوع پر ہم کتاب کے تیسرے حصے میں تفصیل سے بات کریں گے۔

بین الاقوامی سیاسی نظریہ(International Political Theory)

یہ کتاب بین الاقوامی امور (international affairs) پر محض کوئی تبصرہ نہیں ہے، اور نہ ہی یہ جماعتی سیاست (party politics) کے بارے میں ہے۔اس کے برعکس، یہ بین الاقوامی میدان میں سیاسی فلسفے (political philosophy) کے اطلاق سے متعلق ہے۔ اس مضمون کے دائرۂ کار کو ''بین الاقوامی سیاسی نظریہ'' (International Political Theory) کہا جاتا ہے(Brown and Eckersley 2018) ۔

سیاسی فلسفی عموماً زیادہ تر داخلی (domestic) سیاست پر توجہ دیتے ہیں اور اکثر سرحدوں سے باہر ہونے والے واقعات اور نظریات کے اثرات کو نظرانداز یا کم اہمیت دیتے ہیں۔ پہلی نظر میں بین الاقوامی تعلقات (IR) کے نظریہ ساز اس معاملے میں بہتر نظر آتے ہیں کیونکہ وہ فلسفیوں اور مفکرین کے بین الاقوامی نظریات کو شامل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ان کا طریقۂ کار عموماً منظم (structural) نہیں ہوتا۔ وہ اکثر افکار کی تاریخ میں سے منتخب اور جزوی نکات اٹھا لیتے ہیں، اور کسی مفکر کے فکری ورثے کا مکمل اور جامع تجزیہ شاذونادر ہی کرتے ہیں۔

اکثر IR نظریہ ساز کسی نظریے کو صرف اس بنیاد پر ''لبرل'' قرار دے دیتے ہیں کہ اس میں چند عناصر جیسے انفرادیت(individualism) ، سرمایہ داری (capitalism) یا جمہوریت (democracy) موجود ہوں۔ یہ طریقہ کار ناکافی ہے۔

بین الاقوامی سیاسی نظریہ دراصل سیاسی فلسفے اور بین الاقوامی تعلقات (IR) کے درمیان ایک رابطہ (lynchpin) قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ مفکرین کے بین الاقوامی امور سے

متعلق افکار کو دوبارہ دریافت کیا جائے اور انہیں مزید آگے بڑھایا جائے۔ اس کے نتیجے میں ایسے بین الاقوامی تعلقات کے نظریات سامنے آتے ہیں جن کی بنیاد مضبوط سیاسی نظریے پر ہوتی ہے۔ یہی بنیادی طریقۂ کار اس کتاب میں اختیار کیا گیا ہے، جس میں کلاسیکی لبرل مفکرین، خصوصاً ہیوم، اسمتھ، مزِس اور ہائیک، کے افکار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

یہاں پیش کیا گیا کلاسیکی لبرل نظریہ محض ایجاد نہیں کیا گیا، بلکہ ان مفکرین کے افکار اور تحریروں میں گہرائی سے جھانک کر اخذ کیا گیا ہے۔ مصنف نے اس سے قبل بھی اپنی کتاب Classical Liberalism and International Relations Theory (Van de Haar, 2009) میں اس نظریے کا جائزہ لیا تھا، اور اب ان افکار کو مزید وسعت، بہتری اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ یہاں ''ایک نظریہ'' پیش کیا جا رہا ہے، اور کسی حد تک یہ ایک بڑا دعویٰ ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کے نظریے (IR theory) کو سمجھنے کے لیے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ نظریہ سازی کا ایک ہی طریقہ نہیں ہوتا۔ Halliday (1994) کے مطابق IR نظریہ ریاستوں کے درمیان تعلقات، بین الاقوامی اور بین الاقوامی ماورائی (transnational) روابط، اور خود بین الاقوامی نظام کی تجزیاتی اور اصولی (normative) نظریہ سازی ہے۔ یہ ایک کثیر الجہتی (multifaceted) اور طریقہ کار و علمیات کے اعتبار سے تکثیری (pluralist) میدان ہے۔

اسی وسیع دائرے میں کلاسیکی لبرل ازم کو ایک ''عالمی نقطۂ نظر'' (worldview) کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ Griffiths (2011) کے مطابق اس کا مطلب ایک ایسا منفرد فکری مجموعہ ہے جو بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں مخصوص خیالات اور دلائل پر مشتمل ہوتا ہے، جس کے اپنے مخصوص مسائل، ترجیحات اور اسبابی (causal) تجزیے ہوتے ہیں کہ بین الاقوامی تعلقات

کیسے کام کرتے ہیں۔ایک worldview کچھ موضوعات، کرداروں، مقاصد اور تعلقات کو نمایاں کرتا ہے جبکہ کچھ کو کم اہم یا نظرانداز کرتا ہے۔

اس متن میں ایسے بنیادی اجزا (building blocks) پیش کیے جائیں گے جنہیں ملا کر بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں کلاسیکی لبرل نقطۂ نظر تشکیل دیا جا سکے۔ یہ اجزا IR کے بڑے سوالات کا احاطہ کرتے ہیں، جیسے ریاست کا کردار، جنگ، طاقت کا توازن، فوجی مداخلت، بین الاقوامی تعاون، امیگریشن وغیرہ۔

یہ کلاسیکی لبرل نقطۂ نظر ایک ساتھ وضاحتی (descriptive) اور اصولی (prescriptive) دونوں ہے۔ یہ بنیادی سوالات کے جواب دینے کی کوشش کرتا ہے: بین الاقوامی تعلقات فرد کی آزادی پر کیا اثر ڈالتے ہیں؟ اور ایک ایسی دنیا میں، جہاں بین الاقوامی تعلقات کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے، فرد کی آزادی کو بہتر طور پر کیسے محفوظ رکھا جا سکتا ہے؟

یہ جوابات کبھی مکمل نہیں ہو سکتے، کیونکہ دنیا مسلسل غیر متوقع انداز میں بدلتی رہتی ہے۔ اس لحاظ سے ہر نظریہ ایک "لینس" (lens) ہے، کوئی سخت اور حتمی ضابطہ نہیں۔ اس لیے کلاسیکی لبرل بین الاقوامی نظریہ بھی لازماً نامکمل ہے، لیکن اس کے بنیادی اور دیرپا پہلوؤں کو ضرور پیش کیا جا سکتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ مواد خاص طور پر طلبہ اور کلاسیکی لبرل ازم، لبرل ازم اور بین الاقوامی تعلقات کے نظریات میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مفید ثابت ہو گا۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ IR کا موضوع ان افراد میں نسبتاً کم زیرِ بحث آتا ہے جو خود کو کلاسیکی لبرل کہتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ اکثر اس پیش کردہ نظریے سے ناواقف ہوتے ہیں یا مختلف لبرل خیالات کو آپس میں خلط ملط کر دیتے ہیں، جنہیں کتاب کے تیسرے حصے میں واضح کیا جائے گا۔ تاہم مصنف کا مؤقف ہے کہ انہیں زیادہ فکری ہم آہنگی (consistency) پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

آخر میں یہ بھی واضح رہے کہ کلاسیکی لبرل نظریے کے تمام حصے حتمی یا ناقابلِ بحث نہیں ہیں —— مثلاً یورپی یونین یا امیگریشن کے بارے میں اس کے خیالات پر اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ تاہم مجموعی طور پر یہ کتاب ایک ایسا نظریہ پیش کرتی ہے جو کلاسیکی لبرل مفکرین کے اہم ترین افکار سے ہم آہنگ ہے، چاہے وہ داخلی سیاست سے متعلق ہوں یا بین الاقوامی تعلقات سے۔

کتاب کا ڈھانچہ (Structure)

اگلا ابتدائی باب لبرل ازم کی مختلف شاخوں (strands) کا جائزہ لیتا ہے۔ اس کے بعد آنے والے ابواب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

حصہ 1

حصہ اول میں چار اہم کلاسیکی لبرل مفکرین: ڈیوڈ ہیوم، ایڈم اسمتھ، لڈوِگ وون مزِس اور ایف اے ہائیک کے بین الاقوامی تعلقات (international relations) سے متعلق بنیادی افکار پیش کیے گئے ہیں۔ اس کا مقصد قارئین کو ان مفکرین کے بین الاقوامی تعلقات کے نظریات سے آگاہ کرنا اور ان افکار کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط انداز میں پیش کرنا ہے۔
اکثر اوقات (اور خاص طور پر طلبہ کے معاملے میں) جب انہیں ان چار مفکرین میں سے کسی ایک کے افکار سے روشناس کروایا جاتا ہے تو وہ ایک نامکمل اور جزوی تصویر ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ افکار نہ صرف IR کے کتابوں میں بلکہ کلاسیکی لبرل اشاعتوں میں بھی اکثر غائب ہوتے ہیں۔

حصہ 2

حصہ دوم کلاسیکی لبرل بین الاقوامی تعلقات کے نظریے کے بنیادی اجزا (building blocks) پر مشتمل ہے، جو بڑی حد تک ہیوم، اسمتھ، مزِس اور ہائیک کی تحریروں پر مبنی ہیں۔ یہ حصہ پانچ ابواب میں تقسیم ہے، جن میں درج ذیل موضوعات کا جائزہ لیا گیا ہے:

- افراد (Individuals): لبرل ازم داخلی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر انفرادیت (individualism) کا سیاسی اظہار ہے۔ انسانی فطرت اور انفرادی حقوق کے بارے میں کلاسیکی لبرل نقطۂ نظر کیا ہے، اور یہ بین الاقوامی تعلقات سے کیسے جڑتا ہے؟
- گروہ (Groups): انسان سماجی مخلوق ہے اور گروہوں میں زندگی گزارتا ہے۔ بین الاقوامی میدان میں گروہوں کا کیا کردار ہے؟
- تشدد (Violence): افراد اور گروہ بعض اوقات تنازعات میں الجھ جاتے ہیں۔ بین الاقوامی امور میں تشدد کا کیا کردار ہے (اگر کوئی ہے) اور اس سے کیسے نمٹا جانا چاہیے؟
- قواعد (Rules): کیا بین الاقوامی قواعد کی کوئی جگہ ہے؟ اور اگر ہے تو کون سے قواعد ہونے چاہئیں؟
- معیشت (Economics): بین الاقوامی تعلقات میں معاشی پہلوؤں کو کیسے سمجھا جاتا ہے؟

حصہ دوم کے اختتام پر کلاسیکی لبرل بین الاقوامی تعلقات کے نظریے کی مجموعی ساخت پیش کی جاتی ہے۔

حصہ 3

حصہ سوم بین الاقوامی تعلقات کے نظریے (IR theory) سے متعلق ہے۔اس میں موجودہ لبرل نظریات کا جائزہ لیا جاتا ہے اور ان کا کلاسیکی لبرل نظریے سے موازنہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح حقیقت پسندی (realism) کے بڑے نظریے کے ساتھ بھی موازنہ پیش کیا جاتا ہے، اور کلاسیکی لبرل ازم اور آزادی پسندانہ (libertarianism) کے درمیان فرق کو بھی واضح کیا جاتا ہے۔

عملی سیاست (practical politics) سے ربط پیدا کرنے کے لیے کلاسیکی لبرل خارجہ پالیسی کے کچھ رہنما اصول بھی شامل کیے گئے ہیں۔

اختتامی کلمات(Concluding Remarks)

یہ کتاب ایک ابتدائی تعارف introduction یا primer کے طور پر لکھی گئی ہے؛امید ہے کہ اسے آسان اور قابلِ فہم اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ بحث ہے کہ یہاں زیرِ بحث آنے والا ہر موضوع بذاتِ خود ایک مکمل کتاب کا متقاضی ہے۔اس متن میں اکثر موضوعات سطحی بیان ہوئی ہیں۔ جو قارئین کسی مخصوص موضوع میں گہری دلچسپی رکھتے ہوں، وہ تفصیلی مآخذ کے لیے جامع کتابیات (extended bibliography) سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

حسبِ روایت، بین الاقوامی تعلقاتinternational relations (چھوٹے حروف کے ساتھ)، بین الاقوامی امور، عالمی سیاست اور عالمی معاملات کو باہم مترادف (interchangeably)کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور یہ سب حقیقی دنیا کے واقعات کی

طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جبکہ International Relations (بڑے حروف کے ساتھ IR) سے مراد اس مضمون کا علمی و تعلیمی شعبہ ہے۔

اور آخر میں، اس کتاب میں جہاں کہیں بھی "وہ/اس نے" (she/her) استعمال ہوا ہے، قارئین اسے "وہ/اس نے" (he/his) یا کسی بھی ایسی اسم ضمیر کے طور پر بھی سمجھ سکتے ہیں جس کے ساتھ وہ خود کو زیادہ مطمئن محسوس کریں۔

دوسرا باب

لبرل ازم (اور قدامت پسندی)

"کلاسیکی لبرل ازم" کی اصطلاح استعمال کرنے سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ لبرل ازم کی دیگر شکلیں "کلاسیکی" نہیں ہیں۔ برسوں کے دوران اسکالرز نے لبرل ازم کی متعدد اقسام پر لکھا ہے، جن میں لبرٹیرین ازم(libertarianism) ، "بلیڈنگ ہارٹ لبرل ازم"(bleeding-heart liberalism)، اکنامک لبرل ازم، پولیٹیکل لبرل ازم، سوشل لبرل ازم، ہائی لبرل ازم، مائنارکزم(minarchism) ، آبجیکٹوزم(Objectivism) ، اینارکو-کیپٹلزم (anarcho-capitalism) وغیرہ شامل ہیں۔ کئی علمی متون میں "نیو لبرل ازم" (neoliberalism)کاذکر تو ملتاہے، مگراکثراسے واضح طور پر تعریف کرنے کی کوشش تک نہیں کی جاتی۔

بین الاقوامی تعلقات (IR) کے نظریے میں بھی نیولبرل انسٹیٹیوشنلزم، لبرل انٹرنیشنلزم، لبرل انسٹیٹیوشنلزم، ایمبیڈڈ لبرل ازم وغیرہ جیسے تصورات موجود ہیں۔ لبرل ازم کی یہ وسیع اقسام دیگر علمی شعبوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ واضح طور پر یہ صورتحال عام قاری اور حتیٰ کہ ماہرینِ علم دونوں کے لیے الجھن کا باعث بنتی ہے۔ایمون بٹلر(Eamonn Butler) نے ان لبرل نظریات کو اپنی IEA پرائمرز (Classical Liberalism (Butler 2015اور 101

Great Liberal Thinkers (Butler, 2019) میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

بٹلر کے نقطۂ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے یہاں یہ مؤقف پیش کیا گیا ہے کہ لبرل سیاسی فکر کا پیچیدہ ہونا ضروری نہیں، بلکہ سمجھنا ضروری ہے۔ عمومی اصول کے طور پر سیاسی فلسفے کے ایک مستقل سوال کو سامنے رکھنا مفید ہے: فرد اور ریاست کے درمیان منصفانہ تعلق کیا ہے؟

بنیادی طور پر اس سوال کے تین لبرل جوابات ہیں:

1. ریاست کا کردار تقریباً نہ ہونے کے برابر ہو
2. ریاست کا کردار محدود ہو
3. یا ریاست کا کردار نسبتاً وسیع ہو

ان جوابات کے مطابق لبرل ازم کی تین بڑی اقسام بنتی ہیں: لبرٹیرین ازم، کلاسیکی لبرل ازم، اور سوشل لبرل ازم۔ یہ تینوں مکمل طور پر ایک دوسرے سے الگ (mutually exclusive) نہیں ہیں، اور نہ ہی ان سے وابستہ مفکرین ہمیشہ اپنی پوری فکری زندگی میں کسی ایک خانے میں مکمل طور پر فٹ ہوتے ہیں۔ تاہم یہ بنیادی تقسیم لبرل ازم کو سمجھنے کا ایک سادہ مگر معقول طریقہ فراہم کرتی ہے (Van de Haar 2015)۔

تصوری (Conceptual) طریقۂ کار

ان تین لبرل ازم کی اقسام کے فرق کو مائیکل فریڈن (Michael Freeden) نے اپنی کتاب (1996) Ideologies and Political Theory میں بھی واضح کیا ہے۔ وہ نظریہ (ideology)، سیاسی نظریہ (political theory) اور سیاسی فلسفے کے درمیان فرق کرتے ہیں۔

یہاں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، لیکن یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ تمام فکری نظام ایک مشترک خصوصیت رکھتے ہیں: یہ سیاسی تصورات (political concepts) کے ایک مجموعے پر مشتمل ہوتے ہیں جو ایک خاص تعلق میں ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں—مثلاً آزادی(liberty)، انفرادیت (individualism) اور قدرتی حقوق (natural rights)۔

اگرچہ ان تصورات کے معانی اکثر متنازع (contested) ہوتے ہیں، لیکن یہی کسی بھی سیاسی نظریے یا نظریاتی نظام کے بنیادی اجزا (building blocks) ہوتے ہیں۔ ان کی اہمیت مختلف درجوں میں ہو سکتی ہے: مرکزی(core) ، قریبی(adjacent) ، اور حاشیائی (peripheral)۔

ان کے باہمی تعلق کو فریڈن ''مورفولوجی'' (morphology) کہتے ہیں۔ کسی فکری روایت کے بڑے مفکرین کی تحریروں کی بنیاد پر یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ کون سے تصورات مرکزی ہیں، ان کا آپس میں کیا تعلق ہے، اور یوں کسی سیاسی نظریے کی مکمل ساخت اور معنی واضح کیے جا سکتے ہیں۔

لبرل روایات کے اندر تین اقسام میں فرق کرنا ضروری ہے، اگرچہ یہ سب ایک ہی بڑے لبرل خاندان کا حصہ ہیں۔ مثال کے طور پر ''آزادی'' (liberty) تمام لبرل ازم کی مرکزی قدر ہے، لیکن اس کے مختلف معانی ہیں۔

آزادی کی مشہور تقسیم آیزایا برلن (Isaiah Berlin) کے مطابق ''منفی آزادی'' (negative liberty) اور ''مثبت آزادی'' (positive liberty) ہے (Berlin, 1969)۔

- منفی آزادی: دوسروں کی مداخلت سے آزادی
- مثبت آزادی: اپنے حقوق اور صلاحیتوں سے مکمل فائدہ اٹھانے کی آزادی، جس کے لیے اکثر ریاستی مدد درکار ہوتی ہے

کلاسیکی لبرل ازم عموماً منفی آزادی سے وابستہ ہے، جبکہ سوشل لبرل ازم مثبت آزادی کے تصور سے جڑا ہوا ہے (مثلاً F. A. Hayek اور John Rawls کے ہاں)۔
تاہم منفی آزادی کا تصور بھی یکساں نہیں۔ بعض کلاسیکی لبرلز ریاست کی طرف سے ٹیکس لگانے کو مکمل آزادی کی خلاف ورزی نہیں سمجھتے، اگرچہ وہ کم سے کم ٹیکس کے حامی ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض لبرٹیرین (مثلاً Murray Rothbard) ٹیکس کو بنیادی آزادی کی خلاف ورزی سمجھتے ہیں۔ مزید پیچیدگی یہ ہے کہ لبرٹیرین ازم بھی خود تقسیم ہے: ایک طرف اینار کو-کیپیٹلزم (مکمل آزادی) اور دوسری طرف مائنارکزم (Ayn Rand) جیسے مفکرین، جو محدود ریاست کو قبول کرتے ہیں)۔
اس کی وضاحت کے لیے جدول 1 پیش کیا جاتا ہے۔

جدول 1: لبرل ازم کی مورفولوجی

	کلاسیکی لبرل ازم	سوشل لبرل ازم	لبرٹیرین ازم
مرکزی تصورات	منفی آزادی، انسانی فطرت کا حقیقت پسندانہ تصور، خودکار نظم (spontaneous order)، محدود ریاست	مثبت آزادی، انسانی فطرت کا نسبتاً مثبت تصور، سماجی انصاف بطور خود ترقی، وسیع ریاست	منفی آزادی، انسانی فطرت کا حقیقت پسندانہ تصور، خودکار نظم، قدرتی قانون اور سخت ملکیتی حقوق، نہایت محدود یا

			غیر موجود ریاست
قریبی تصورات	قدرتی قانون، قانون کی حکمرانی/کانسٹیٹیوشنل ازم	جدید انسانی حقوق، قانون کی حکمرانی اور غیر جانبدار ریاست، سماجی معاہدہ (Mill: utilitarianism)	مائنارکزم: انتہائی محدود ریاست، قانون کی حکمرانی
حاشیائی تصورات	سماجی انصاف، ملکیتی حقوق کا سخت دفاع	ملکیتی حقوق، خودکار نظم	سماجی انصاف

ماخذ: Van de Haar (2015)

کلاسیکی لبرل ازم

کلاسیکی لبرل ازم کی ابتدا اٹھارویں صدی کے سکاٹش روشن خیالی (Scottish Enlightenment) میں ہوئی، خاص طور پر ڈیوڈ ہیوم اور ایڈم اسمتھ کی تحریروں میں، جو دیگر فرانسیسی روشن خیالی مفکرین سے بھی متاثر تھے۔ بعد میں اس روایت کو لڈوِگ وون مزِس، ایف اے ہائیک، ملٹن فریڈمین اور جیمز بکانن جیسے مفکرین نے آگے بڑھایا۔

کلاسیکی لبرل ازم انسانی فطرت کو حقیقت پسندانہ انداز میں دیکھتا ہے، یعنی انسان صرف عقلی نہیں بلکہ جذباتی بھی ہوتا ہے۔ انفرادی آزادی اس کا بنیادی مقصد ہے، اور یہ آزادی کلاسیکی انسانی حقوق، قانون کی حکمرانی، اور معاشرتی خودکار نظم (spontaneous order) جیسے آزاد منڈی کے نظام کے ذریعے بہتر طور پر محفوظ رہتی ہے۔

تاہم کلاسیکی لبرلز انسان کو محض ایک تنہا فرد نہیں سمجھتے۔ ایڈم اسمتھ بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ ''انسان ایک جزیرہ نہیں ہے''۔ مزِس ''سماجی تعاون'' (social cooperation) پر زور دیتے ہیں، جبکہ جدید کلاسیکی لبرل مفکر Ashford کے مطابق سول سوسائٹی وہ تمام رضاکارانہ ادارے ہیں جو فرد اور ریاست کے درمیان موجود ہوتے ہیں، جیسے خاندان، مذہبی ادارے، کھیلوں کے کلب اور فلاحی تنظیمیں۔ اس لیے یہ سمجھنا غلط ہے کہ تنہا فرد بھی مکمل طور پر آزاد ہو سکتا ہے — انسان بنیادی طور پر ایک سماجی وجود ہے۔

کلاسیکی لبرل ریاست محدود ہوتی ہے، یعنی اس کے فرائض محدود ہوتے ہیں: دفاع، پولیس، عدلیہ، کچھ حد تک فلاحی انتظامات، ماحولیاتی ضابطے، اور وہ عوامی خدمات جو مارکیٹ خود فراہم نہیں کر سکتی۔ کلاسیکی لبرلز ریاست کے حجم پر اختلاف رکھتے ہیں، لیکن عموماً وہ اسے سوشل لبرلز سے چھوٹا اور لبر ٹیرینز سے بڑا سمجھتے ہیں۔

سماجی لبرل ازم (Social Liberalism)

سوشل لبرلز عمومی طور پر لبرل ازم کی وہ شکل ہیں جو آج کے امریکی سیاسی مفہوم کے مطابق سمجھی جاتی ہے۔ برطانیہ میں سماجی لبرل فکر کی ابتدا انیسویں صدی میں ہوئی، خصوصاً جان اسٹورٹ مل (John Stuart Mill) اور ان کے بعد آنے والے مفکرین کے ہاں، جیسے کہ انیسویں صدی کے آخر کے ''نیو لبرلز'' (New Liberals) جن میں لیونارڈ ہوب ہاؤس (Leonard Hobhouse)، تھامس ہل گرین (Thomas Hill Green)، جان ہابسن (John Hobson) اور ڈیوڈ رِچی (David Ritchie) شامل تھے۔

1970 کی دہائی کے بعد جان رالز (John Rawls) اور ان کے پیروکار دنیا بھر میں سماجی لبرلز کے لیے سب سے اہم فکری ماخذ بن گئے۔ سوشل لبرلز کے نزدیک لبر ٹیرین اور کلاسیکی لبرل

نظریات ایک ایسے معاشرے کی طرف لے جاتے ہیں جس میں شدید سماجی ناانصافی (social injustice) موجود ہوتی ہے۔

ان کے مطابق افراد کو اپنی صلاحیتیں ترقی دینے کے لیے مواقع اور صلاحیت درکار ہوتی ہے— انہیں تعلیم، مہارتیں اور علم حاصل کرنے کا موقع ملنا چاہیے تاکہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کو مارکیٹ اور زندگی کے دیگر شعبوں میں استعمال کر سکیں۔ اسی طرح انہیں جمہوری فیصلوں کے عمل میں مکمل شرکت کا حق بھی حاصل ہونا چاہیے۔ بصورتِ دیگر، ان کے نزدیک آزادی (liberty) محض ایک رسمی تصور رہ جاتا ہے جس کی عملی اہمیت کم ہوتی ہے۔

سماجی انصاف کے اس تصور کے نتیجے میں آمدنی کی دوبارہ تقسیم (redistribution of income) ضروری سمجھی جاتی ہے تاکہ تعلیم سب کے لیے دستیاب ہو اور ایک فلاحی نظام (welfare system) جیسے سماجی تحفظ اور صحت عامہ کمزور طبقات کا خیال رکھ سکے۔ اس کے نتیجے میں کلاسیکی لبرل اور لبرٹیرین نظریات کے مقابلے میں ریاست کا کردار زیادہ بڑا اور ٹیکسوں کا بوجھ نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔

سوشل لبرلز کے مطابق محض "خودکار نظم" (spontaneous order) ان کے اہداف حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ ان کا انسانی فطرت کے بارے میں نسبتاً مثبت تصور یہ ہے کہ آخرکار عقل جذبات پر غالب آسکتی ہے۔ اسی لیے وہ عقل پر مبنی ریاستی یا عوامی ادارہ جاتی ڈھانچوں پر اعتماد کرتے ہیں، جن کا مقصد فرد کی ترقی ہوتا ہے اور یہی ان کے نزدیک آزادی کا حقیقی مطلب ہے۔

لبرٹیرین ازم (Libertarianism)

لبرٹیرین ازم بھی، سماجی لبرل ازم کی طرح، انیسویں صدی سے اپنی جڑیں رکھتا ہے اور اس کی مثالیں لزینڈر سپونر (Lysander Spooner)، ہربرٹ اسپینسر (Herbert Spencer)

اور ولیم گراہم سمنر (William Graham Sumner) جیسے مفکرین کی تحریروں میں ملتی ہیں۔

لبرٹیرین مفکرین، کلاسیکی لبرلز بلکہ سوشل لبرلز پر تنقید کرتے ہیں کہ وہ ریاست کو ضرورت سے زیادہ بڑا ہونے دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک منصفانہ معاشرہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب فرد کے قدرتی حقوق(natural rights) زندگی، آزادی اور ملکیت کا سختی سے تحفظ کیا جائے۔

اگرچہ قدرتی قانون (natural law) کی کچھ جھلک کلاسیکی لبرل ازم میں بھی ملتی ہے، لیکن لبرٹیرین اسے زیادہ سخت انداز میں ملکیتی حقوق کے دفاع کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

لبرٹیرین معاشرے کا تصور ایک ایسے نظام پر مبنی ہے جہاں آزاد افراد اپنی صلاحیتوں کو رضاکارانہ تعاون (voluntary cooperation) کے ذریعے استعمال کریں۔ کچھ لبرٹیرین، جیسے مرے روتھبارڈ (Murray Rothbard) اور ہنس ہرمن ہوپے (Hans-Hermann Hoppe)، یہ موقف رکھتے ہیں کہ یہ معاشرہ مکمل طور پر خودکار نظم (spontaneous order) پر چل سکتا ہے، لہٰذا ریاست کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

جبکہ کچھ دیگر، جیسے این رینڈ(Ayn Rand) ، یہ سمجھتے ہیں کہ دفاع، پولیس اور عدلیہ کو منظم کرنے کے لیے محدود ریاست کی ضرورت ہے۔

زیادہ تر لبرٹیرین کسی بھی قسم کی مرکزی سطح پر آمدنی کی دوبارہ تقسیم (redistribution) کو غیر منصفانہ سمجھتے ہیں۔ اس کے بجائے وہ خودکار معاشرتی قوتوں اور انفرادی عطیات پر انحصار کرتے ہیں تاکہ کمزور طبقات کی مدد کی جا سکے۔

کئی لبرٹیرین یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اگر افراد کسی ریاست میں رہنا نہیں چاہتے تو انہیں اس سے علیحدگی (secession) یا نئی سیاسی اکائیاں بنانے کی آزادی ہونی چاہیے۔

بین الاقوامی تعلقات (IR) کے نظریے میں اطلاق

اگرچہ فریڈن (1996) کی توجہ بنیادی طور پر ملکی سیاست پر مرکوز ہے، تاہم لبرل ازم کی ان تینوں اقسام کے مابین موجود اختلافات بین الاقوامی امور سے متعلق ان کے نظریات میں بھی نمایاں طور پر جھلکتے ہیں۔ مثال کے طور پر، انفرادی زندگی اور عالمی سیاست میں قوم کے کردار، آزاد تجارت کے ذریعے بین الاقوامی امن کے فروغ سے متعلق لبرل فکر کا دیرینہ مباحثہ، اور بین الاقوامی سرکاری تنظیموں (International Governmental Organizations) کی افادیت اور کردار جیسے موضوعات انہی اختلافات کی عکاسی کرتے ہیں۔

یہ کتاب بنیادی طور پر بین الاقوامی تعلقات کے کلاسیکی لبرل نظریے (Classical Liberal Theory of International Relations) پر مرکوز ہے۔ موجودہ دور میں بین الاقوامی تعلقات کے بیشتر لبرل نظریات سماجی لبرل ازم (Social Liberalism) سے زیادہ متاثر ہیں، جیسا کہ اس کتاب کے تیسرے حصے میں تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔ اس کے برعکس، بین الاقوامی تعلقات کے نظریے پر مبنی بیشتر کتب میں لبرٹیرین (Libertarian) نقطۂ نظر کو شاذ و نادر ہی زیرِ بحث لایا جاتا ہے، تاہم اس کتاب کے تیسرے حصے میں اس فکر کا بھی مفصل جائزہ پیش کیا جائے گا۔

لبرل ازم اور کنزرویٹزم کے درمیان فرق

چار کلاسیکی لبرل مفکرین کے افکار کا جائزہ لینے سے قبل، مناسب ہوگا کہ لبرل ازم اور کنزرویٹزم (قدامت پسندی) کے درمیان بنیادی امتیازات کو واضح کر لیا جائے۔ ان دونوں نظریات کے باہمی تعلق کے بارے میں اکثر ابہام پایا جاتا ہے، خصوصاً یورپ میں، جہاں کلاسیکی لبرل فکر رکھنے والے

سیاست دان لبرل اور کنزرویٹو، دونوں جماعتوں میں پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح، آزاد منڈی (Free Market) کی پالیسیوں کو بھی اکثر کنزرویٹو سیاسی جماعتوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ عملی سیاست میں بہت سے کنزرویٹو رہنما لبرل معاشی نظریات سے اتفاق کرتے ہیں، جبکہ بعض لبرل ایسے تصورات کی حمایت کرتے ہیں جو عموماً کنزرویٹزم سے وابستہ سمجھے جاتے ہیں، مثلاً خاندانی نظام کی سماجی اہمیت اور اس کے استحکام پر زور۔ چونکہ کنزرویٹزم اور کلاسیکی لبرل ازم دونوں اپنے اپنے اندر فکری رجحانات کا ایک وسیع دائرہ سموئے ہوئے ہیں، اس لیے ان کے درمیان بعض مشترک نکات اور نظریاتی مماثلتوں کا پایا جانا ایک فطری امر ہے۔

چنانچہ تقابلی مطالعے کی غرض سے، یہاں کنزرویٹزم (قدامت پسندی) کے مرکزی دھارے کی نمائندگی ایڈمنڈ برک (Edmund Burke)، الیکسس دی توکویل (Alexis de Tocqueville)، لارڈ ایکٹن (Lord Acton)، مائیکل اوکشاٹ (Michael Oakeshott) کے افکار، نیز راجر سکروٹن کی The Meaning of Conservatism (1986)، رابرٹ نسبیٹ کی Conservatism (2001) اور رسل کرک کی The Conservative Mind (1985) کی روشنی میں کی گئی ہے۔ تاہم، اکیسویں صدی کے آغاز میں مقبول ہونے والا امریکی نیو کنزرویٹزم (American Neoconservatism) اس بحث کا حصہ نہیں ہے۔

انسانی فطرت کے بارے میں کنزرویٹزم کا تصور لبرل ازم کی نسبت زیادہ محتاط اور قدرے بدبینانہ / منفی ہے۔ کنزرویٹو مفکرین کے نزدیک انسان خیر و شر، دونوں کا اہل ہے، لیکن اس میں برائی کی طرف مائل ہونے کا رجحان بھی موجود رہتا ہے۔ کلاسیکی لبرلز کی طرح، لیکن سوشل لبرلز کے برعکس، کنزرویٹوز بھی انسانی عقل کی صلاحیت کے بارے میں غیر معمولی توقعات نہیں رکھتے۔ کنزرویٹو مفکر مائیکل اوکشاٹ نے ”عقلیت کے فریب“ (Rational Illusion) پر تنقید کرتے ہوئے اس تصور کی مخالفت کی جو سماجی انجینئرنگ (Social Engineering) کی

بنیاد بنتا ہے۔ ان کے نزدیک محض عقل پر حد سے زیادہ انحصار انسانی تجربے، تاریخی ارتقا اور اخلاقی اقدار کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتا ہے (Oakeshott, 1962)۔

راجر سکروٹن کے مطابق، کنزرویٹزم اور لبرل ازم کی تمام اقسام کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ کنزرویٹوز انفرادی آزادی کو سیاسی فکر اور سیاسی عمل کی اعلیٰ ترین قدر نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک فرد اپنی فطرت میں مکمل طور پر خود مختار اور منفرد ہستی نہیں، بلکہ وہ معاشرتی روایات، رسوم اور سماجی اداروں کی تشکیل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کنزرویٹو مفکرین اس تصور کو، کہ انسان فطری طور پر محض ایک آزاد اور خود مختار فرد ہے، ''لبرل افسانہ'' (Liberal Myth) قرار دیتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق، انفرادی آزادی کوئی مطلق قدر نہیں، بلکہ اسے ہمیشہ اس تناظر میں جانچا جانا چاہیے کہ کہیں اس سے معاشرتی نظم، سماجی ہم آہنگی اور اجتماعی ڈھانچے کو نقصان تو نہیں پہنچ رہا۔ چنانچہ منفی آزادی (Negative Freedom) بذاتِ خود کوئی حتمی مقصد نہیں سمجھی جاتی۔ اسی وجہ سے کنزرویٹوز بعض حالات میں رازداری اور نجی زندگی کے حق میں مداخلت کو بھی جائز قرار دیتے ہیں، اگر اس سے کسی بڑے اجتماعی مقصد، مثلاً ریاست کی سلامتی یا معاشرتی استحکام، کا تحفظ مقصود ہو۔

قدامت پسند (Conservatives) اصولی طور پر ریاست کی معاشرے میں مداخلت کے مخالف نہیں ہوتے۔ ان کے نزدیک فرد اور معاشرہ ایک دوسرے سے جدا نہیں، بلکہ معاشرہ ایک جاندار اکائی (Organic Society) ہے جس میں ہر فرد کو اپنا متعین کردار ادا کرنا چاہیے۔ اسی لیے ان کے ہاں نظم و ضبط بنیادی اہمیت رکھتا ہے، اور وہ روایت، روایتی اقدار، اخلاقی اصول، رسوم و رواج اور معاشرتی عادات کو معاشرتی استحکام کی بنیاد تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانی کمزوریوں پر قابو پانے کے لیے بنیادی اخلاقی فضائل (Cardinal Virtues) کی تعلیم و تربیت نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔

قدامت پسندوں کے نزدیک ریاست کی اولین ذمہ داری امن وامان اور سماجی نظم کا قیام ہے، اور جب تک یہ مقصد آئینی حدود کے اندر رہ کر حاصل کیا جائے، ریاستی اختیار مکمل طور پر جائز ہے۔ اسی تناظر میں اتھارٹی (Authority) کا احترام اور اس کی ضرورت بھی قدامت پسند فکر کے بنیادی اصولوں میں شمار ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک انسان پیدائشی طور پر صلاحیتوں، حیثیت اور استعداد کے اعتبار سے برابر نہیں ہوتے اور نہ ہی عملی زندگی میں مساوات حاصل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا معاشرتی نظم کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ اختیار اور اقتدار معاشرے کے ان محدود طبقات کے ہاتھ میں ہو جو قیادت کی صلاحیت رکھتے ہوں، جبکہ دیگر افراد ان کی جائز اتھارٹی کو قبول کریں۔ ایڈمنڈ برک (Edmund Burke) نے ایسے طبقے کو ''فطری اشرافیہ'' (Natural Aristocracy) کا نام دیا تھا۔

قدامت پسندوں کے نزدیک یہ رویہ اور طرزِ فکر خاندان، کلیسا، تعلیمی اداروں، فوج، پیشہ ورانہ انجمنوں (Guilds) اور دیگر سماجی اداروں کے ذریعے پروان چڑھتا ہے۔ اسی طرح وہ نجی ملکیت، وراثت اور خاندانی نظام کو بھی ایک دوسرے سے گہرا مربوط سمجھتے ہیں، تاہم ان کی اہمیت فرد کے ذاتی مفاد کی وجہ سے نہیں، بلکہ معاشرے کے استحکام اور سماجی ڈھانچے کی بقا کے حوالے سے ہوتی ہے، خصوصاً زمین کی ملکیت کو وہ اس تناظر میں خاص اہمیت دیتے ہیں۔

قدامت پسند تبدیلی کے اصولی مخالف نہیں ہوتے، تاہم وہ ہر تبدیلی کو سماجی نظم، استحکام اور معاشرتی تسلسل کے معیار پر پرکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایسی تبدیلی جو معاشرتی ہم آہنگی کو نقصان پہنچائے، معاشرے کی بنیادوں کو منہدم کرے، فطری ارتقا کے برخلاف ہو یا انقلابی نوعیت کی ہو، قابلِ قبول نہیں۔ اس کے باوجود وہ موجودہ حالات (Status Quo) کے اندھے محافظ بھی نہیں ہیں، بلکہ وہ تدریجی، فطری اور ارتقائی تبدیلی کے حامی ہیں، نہ کہ ایسے انقلابی اقدامات کے جو صدیوں کے تجربے اور ''دانائیِ ایام'' (Wisdom of the Ages) سے تشکیل پانے والے سماجی نظم کو یکسر بدل دیں۔

یہ تصور کسی حد تک کارل پوپر (Karl Popper) کے نظریہ "تدریجی سماجی اصلاح" (Piecemeal Social Engineering) سے مشابہ ہے، جسے فریڈرک ہائیک (Friedrich Hayek) نے بھی پسند کیا اور اجتماعی (Collectivist) انقلابی تبدیلیوں کے مقابلے میں اسی تدریجی اصلاح کے حق میں استدلال کیا۔ تاہم، لبرلز قدامت پسندوں کی نسبت کاروباری سرگرمیوں، تکنیکی ترقی اور سائنسی اختراعات سے پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں کہیں زیادہ پُرامید ہوتے ہیں۔

قدامت پسند فکر میں مذہب کو لبرل ازم کے مقابلے میں کہیں زیادہ مرکزی حیثیت حاصل ہے، خصوصاً سماجی قدامت پسندوں کے ہاں اسقاطِ حمل، ہم جنس پرستوں کے حقوق، یوتھینیشیا (Euthanasia) اور اسی نوعیت کے دیگر اخلاقی و سماجی مسائل میں مذہب فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ جہاں قدامت پسند ایسے معاملات کو منظم کرنے یا ان پر پابندی عائد کرنے کے لیے ریاستی طاقت کے استعمال میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے، وہیں بیشتر لبرلز ان امور کو فرد کے نجی دائرۂ اختیار کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ بہت سے لبرلز خود مذہبی ہوتے ہیں، لیکن وہ نجی اور عوامی زندگی کے درمیان واضح امتیاز برقرار رکھتے ہیں اور اپنی ذاتی مذہبی آراء یا مذہبی طرزِ عمل دوسروں پر مسلط کرنے کے قائل نہیں ہوتے، جبکہ قدامت پسند عموماً مذہبی اقدار کو عوامی اور ریاستی زندگی کا حصہ بنانے کے حامی ہوتے ہیں۔

اگرچہ قدامت پسند (Conservatives) اور کلاسیکی لبرلز (Classical Liberals) آزاد منڈی (Free Market) کی اہمیت پر متفق ہو سکتے ہیں، تاہم قدامت پسند ریاستی مداخلت کے لیے نسبتاً زیادہ آمادہ ہوتے ہیں، مثلاً قومی سطح پر نمایاں صنعتوں یا کمپنیوں (National Champions) کی سرپرستی اور تحفظ کے لیے۔ سیاسی اعتبار سے بھی ان کا رجحان اکثر ایک ردِّ عمل پر مبنی قوت (Countermovement) کا ہوتا ہے؛ یعنی جب معاشرے میں بائیں بازو (Left) کا غلبہ ہو تو وہ دائیں بازو (Right) کی جانب جھکاؤ اختیار

کرتے ہیں، اور جب دائیں بازو کو برتری حاصل ہو تو وہ توازن قائم کرنے کے لیے نسبتاً بائیں جانب مائل ہو جاتے ہیں۔ راجر اسکرٹن (Roger Scruton) کے مطابق:

''لبرلز آزادی کے طالب ہوتے ہیں، سوشلسٹ مساوات کے، اور قدامت پسند ذمہ داری کے۔ اور ذمہ داری کے بغیر نہ آزادی دیرپا رہ سکتی ہے اور نہ مساوات۔''

اس کتاب کے تناظر میں لبرل ازم اور قدامت پسندی کے درمیان سب سے اہم فرق یہ ہے کہ بیشتر قدامت پسند، خصوصاً نو قدامت پسند (Neoconservatives)، بین الاقوامی تعلقات کے حقیقت پسندانہ نظریے (Realist Theory of International Relations) سے وابستہ سمجھے جاتے ہیں، جس پر تفصیل سے باب 11 میں بحث کی جائے گی۔

فریڈن (Freeden) کے نظریۂ مورفولوجی (Morphology) کے مطابق، قدامت پسندی (Conservatism) کے بنیادی، متصل اور ثانوی تصورات کو درج ذیل جدول میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

جدول 2: قدامت پسندی کی مورفولوجی

تصورات کی درجہ بندی	اہم تصورات
بنیادی تصورات (Core Concepts)	انسانی فطرت کے بارے میں منفی تصور، تدریجی و نامیاتی تبدیلی (Organic Change)، نظم و ضبط، گروہ/خاندان، درجہ بندی (Hierarchy)

متصل تصورات (Adjacent Concepts)	فعال ریاست(Active State) ، آزاد منڈی/خود رو نظم (Free Market/Spontaneous Order)، ردِّ عمل پر مبنی سیاسی رجحان(Counter-Movement) ،)زمینی)ملکیت
ثانوی تصورات (Peripheral Concepts)	انفرادی حقوق،آزادی

ماخذ :وان ڈے ہار(Van de Haar, 2015)

تیسرا باب

اسکاٹش روشن خیالی(Scottish Enlightenment):

ڈیوڈ ہیوم اور ایڈم اسمتھ

کتاب کے اس پہلے حصے میں ہم کلاسیکی لبرل ازم کے چار عظیم مفکرین ڈیوڈ ہیوم (David Hume)،ایڈم اسمتھ(Adam Smith) ،لڈوِگ فان میزس (Ludwig von Mises)اور فریڈرک آگسٹ فان ہائیک(F. A. Hayek) کے بین الاقوامی تعلقات سے متعلق بنیادی نظریات کا جائزہ لیں گے۔ اس باب میں اسکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والے دو فلسفیوں، ڈیوڈ ہیوم اور ایڈم اسمتھ، کے افکار پر توجہ مرکوز کی جائے گی، جبکہ اگلا باب آسٹریا کے دو مفکرین، میزس اور ہائیک، کے نظریات کے لیے مختص ہوگا۔ بعد ازاں، کتاب کے دوسرے حصے میں ان مفکرین کے خیالات کی مزید تفصیل سے وضاحت کی جائے گی تاکہ بین الاقوامی تعلقات کے کلاسیکی لبرل نظریے کی ایک جامع تشکیل ممکن ہو سکے۔

ان چار مفکرین پر توجہ مرکوز کرنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ دیگر کلاسیکی لبرل مفکرین، جیسے ملٹن فریڈمین (Milton Friedman) یا جیمز بیوکنن (James Buchanan)، کی اہمیت سے انکار کیا جائے۔ بلکہ اس کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ بین الاقوامی تعلقات کے کسی بھی

سنجیدہ کلاسیکی لبرل نظریے یا تصور کی تشکیل ان چار مفکرین کے افکار کو پیشِ نظر رکھے بغیر ممکن نہیں۔

یہ بات بھی تسلیم کی جانی چاہیے کہ ڈیوڈ ہیوم (David Hume) اور ایڈم اسمتھ (Adam Smith) دونوں اپنے سے پہلے آنے والے متعدد مفکرین کے افکار سے متاثر تھے۔ ان میں قدیم یونان اور روم کے فلسفیوں سے لے کر سولہویں اور سترہویں صدی کے مفکرین، مثلاً فرانسس بیکن (Francis Bacon) اور تھامس ہوبز (Thomas Hobbes)، نیز اسکاٹش روشن خیالی (Scottish Enlightenment) کے نمایاں اہلِ فکر، جیسے گیرشم کارمائیکل (Gershom Carmichael)، فرانسس ہچیسن (Francis Hutcheson)، شافٹسبری (Shaftesbury) اور لارڈ کیمز (Lord Kames) شامل ہیں۔ جہاں مناسب ہوگا، ان دیگر مفکرین کے نظریات اور ان کے اثرات کا بھی تذکرہ کیا جائے گا۔

ڈیوڈ ہیوم (1711–1776)

اگرچہ ڈیوڈ ہیوم (David Hume) کو بنیادی طور پر ایک عظیم فلسفی کے طور پر سراہا جاتا ہے، لیکن اس حقیقت کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ انہوں نے بین الاقوامی امور پر بھی گراں قدر تحریریں لکھیں اور خود سفارتی میدان میں عملی تجربہ بھی حاصل کیا۔ بین الاقوامی سطح پر ان کی پہلی سرکاری ذمہ داریاں 1746ء اور 1748ء میں اس وقت شروع ہوئیں جب انہوں نے اسکاٹش نژاد امریکی فوجی اور سیاست دان جنرل آرتھر سینٹ کلیئر (General Arthur St Clair) کے معاون کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس دوران وہ پہلے مغربی فرانس کے ایک

سفارتی مشن میں شریک ہوئے، اور بعد ازاں ویانا اور ٹورین کے ایک خفیہ سفارتی مشن پر بھی روانہ کیے گئے۔

1760ء کی دہائی کے وسط میں ہیوم نے پیرس میں برطانوی سفارت خانے میں خدمات انجام دیں۔ ابتدا میں وہ برطانوی سفیر کے ذاتی سیکرٹری مقرر ہوئے، بعد ازاں سفارت خانے کے سیکرٹری اور قائم مقام سفیر (Chargé d'Affaires) کے منصب پر بھی فائز رہے۔ اس کے بعد 1767ء سے 1768ء تک تقریباً ایک سال کے لیے انہوں نے شمالی محکمۂ خارجہ (Northern Department) میں انڈر سیکرٹری آف اسٹیٹ کے طور پر خدمات انجام دیں، جو بعد میں برطانیہ کے دفترِ خارجہ (Foreign Office) کا حصہ بن گیا۔

تاہم، یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ ہیوم نے بین الاقوامی تعلقات سے متعلق اپنی بیشتر اہم تصانیف اور نظریات پیرس میں تقرری سے قبل ہی قلم بند کر دیے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا بین الاقوامی فکر و نظر صرف عملی سفارتی تجربے کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ اس کی بنیاد ان کے گہرے فلسفیانہ مطالعے اور سیاسی تجزیے پر بھی استوار تھی۔

بین الاقوامی امور کے بارے میں ڈیوڈ ہیوم (David Hume) کی فکر کا نقطۂ آغاز فرد ہے (اس حوالے سے باب 5 بھی ملاحظہ کیجیے)۔ ان کے نزدیک قوم (Nation) کا تصور ہر انسان کے اندر کسی نہ کسی درجے میں مثبت یا منفی جذبات کو جنم دیتا ہے۔ ہیوم کے خیال میں قومی فخر (National Pride) ان جذبات میں سب سے زیادہ مثبت جذبہ ہے۔ یہ جذبہ بعض اوقات براہِ راست تجربات سے پیدا ہوتا ہے، مثلاً اپنے وطن کے قدرتی مناظر کی خوبصورتی، اور بعض اوقات بالواسطہ عوامل سے، جیسے ملک کی پیداوار کی عمدگی یا وہاں کے لوگوں کی خوش حالی اور مسرت۔

ہیوم کا استدلال تھا کہ کسی فرد کے لیے کسی غیر ملک کے ساتھ وہی گہرا جذباتی تعلق قائم کرنا ممکن نہیں جو اسے اپنے وطن سے ہوتا ہے۔ اگرچہ انسان اخلاقی اعتبار سے اپنی قوم کے افراد اور غیر

ملکیوں، دونوں میں یکساں خوبیوں کی قدر کرتا ہے، تاہم ہیوم کے مطابق انسان اپنے ہم وطنوں کے ساتھ بہ نسبت غیر ملکیوں کے فطری طور پر زیادہ قربت اور وابستگی محسوس کرتا ہے۔ یہی فطری میلان انسانی تعلقات اور بین الاقوامی سیاست کی تفہیم میں ایک بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اگرچہ جدید قاری کو یہ خیالات کسی حد تک قوم پرستانہ (Nationalistic) محسوس ہو سکتے ہیں، لیکن ڈیوڈ ہیوم (David Hume) ہر گز قوم پرست نہیں تھے۔ اپنی تحریروں اور ذاتی زندگی، دونوں میں وہ بین الاقوامیت (Internationalism) کے حامی رہے (Van de Haar, 2008)۔ ان کے نزدیک اعتدال (Moderation) بنیادی اصول تھا، جبکہ کسی بھی انتہا پسندانہ رویے کو وہ نامناسب سمجھتے تھے۔ ہیوم کا خیال تھا کہ وہ تمام منصوبے جو انسانی فطرت کو بنیادی طور پر تبدیل کرنے کے تصور پر مبنی ہوں، لازماً ناکام رہیں گے، کیونکہ وہ محض خیالی اور غیر حقیقی مفروضوں پر استوار ہوتے ہیں۔

ہیوم کے نزدیک خود مختار ریاستیں (Sovereign States) عالمی سیاست کی بنیادی اکائیاں تھیں، اور ہر ریاست کو اپنی قومی خود مختاری (National Sovereignty) کا حق حاصل تھا۔ اسی بنا پر وہ کسی ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت کو مناسب نہیں سمجھتے تھے، خواہ اس ریاست کا طرزِ عمل کیوں نہ قابلِ اعتراض ہو۔ البتہ ان کے نزدیک خود مختاری مطلق اور لامحدود نہیں تھی؛ مثال کے طور پر کوئی بھی ریاست سمندر پر اپنی ملکیت کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

تاہم، معمول کے حالات میں بین الاقوامی نظم و ضبط کا انحصار خود مختار ریاستوں اور ان کے باہمی تعاون پر ہوتا ہے۔ ہیوم کے مطابق ہمسایہ ممالک پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ "اس باہمی تجارت کی نوعیت کے مطابق، جو وہ ایک دوسرے کے ساتھ انجام دیتے ہیں، خوشگوار اور مناسب تعلقات برقرار رکھیں۔"

ہیوم کی نظر میں دنیا محض بے نظمی (Anarchy) یا طاقت کے لیے دائمی کشمکش کا میدان نہیں تھی، بلکہ خصوصاً یورپ میں یہ اقوام کے ایک بین الاقوامی معاشرے (International

(Society of Nations) کی صورت اختیار کر چکی تھی، جس کی بنیاد باہمی تعاون، سفارت کاری اور مشترکہ قواعد و ضوابط پر استوار تھی۔ ان قواعد میں سفیروں کے سفارتی استثنا (Diplomatic Immunity) کا احترام، جنگ کے باضابطہ اعلان کا اصول، زہریلے ہتھیاروں کے استعمال کی ممانعت، اور جنگی قیدیوں کے ساتھ انسانی اور مہذب سلوک کی پابندی جیسے اصول شامل تھے۔

ڈیوڈ ہیوم (David Hume) کے نزدیک قوانینِ اقوام (Law of Nations) دراصل فطری قوانین (Laws of Nature) کی بین الاقوامی سطح پر توسیع اور تطبیق تھے۔ ان کی بنیاد تین بنیادی اصولوں پر استوار تھی:

1. ملکیت کے استحکام (Stability of Possession) کا اصول؛
2. باہمی رضامندی سے ملکیت کی منتقلی (Transfer of Property by Consent)؛ اور
3. وعدوں کی پابندی (Performance of Promises)۔

ہیوم کے مطابق یہ تینوں اصول نہ صرف داخلی سطح پر معاشرتی نظم کے لیے ضروری ہیں بلکہ بین الاقوامی تعلقات میں بھی یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے فوائد بھی وہی ہیں اور ان کا طریقۂ کار بھی بنیادی طور پر یکساں رہتا ہے۔

ان کے نزدیک اگر حقِ ملکیت کا احترام نہ کیا جائے تو بین الاقوامی سطح پر جنگ معمول بن جائے گی۔ اسی طرح اگر ملکیت کی منتقلی باہمی رضامندی سے نہ ہو تو تجارت فروغ نہیں پا سکتی۔ مزید برآں، اگر ریاستیں اپنے وعدوں کی پابندی نہ کریں تو اتحاد (Alliances) اور بین الاقوامی معاہدے (Treaties) بے معنی اور غیر مؤثر ہو جائیں گے۔

اس ضمن میں ہیوم پر سیموئیل پوفنڈورف (Samuel Pufendorf) اور ہیوگو گروشیئس (Hugo Grotius) کے افکار کا نمایاں اثر تھا (Harris, 2015)۔ ان کی

فکر کو بین الاقوامی تعلقات میں کلاسیکی لبرل ازم کے ”زیریں سطح سے بالائی سطح تک“ (Bottom-up) نقطۂ نظر کا شاید سب سے جامع اور واضح اظہار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس تصور کے مطابق پائیدار بین الاقوامی نظم کسی بالادست عالمی حکومت کے ذریعے نہیں، بلکہ خود مختار ریاستوں کی باہمی رضامندی، معاہدات کی پاسداری، نجی ملکیت کے احترام اور رضاکارانہ تعاون کے نتیجے میں بتدریج وجود میں آتا ہے۔

تاہم، ڈیوڈ ہیوم (David Hume) کے نزدیک داخلی سیاست اور بین الاقوامی سیاست ایک دوسرے سے مکمل طور پر یکساں نہیں تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ بین الاقوامی سطح پر اخلاقی اور قانونی ذمہ داریوں کی قوت داخلی سطح کے مقابلے میں نسبتاً کم ہوتی ہے۔ اسی لیے حکمرانوں (Princes) پر عائد اخلاقی ذمہ داریاں بھی بین الاقوامی معاملات میں اتنی سخت نہیں ہوتیں جتنی اپنے ملک کے اندر ہوتی ہیں۔

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ ہیوم معاہدوں کی خلاف ورزی یا میکیاویلی (Machiavelli) کے طرزِ سیاست جس میں محض اقتدار اور مفاد کو ہر چیز پر ترجیح دی جاتی ہے، کے حامی تھے۔ بلکہ ان کا مقصد صرف اس حقیقت کو تسلیم کرنا تھا کہ بین الاقوامی قوانین اور اصول داخلی قوانین کی نسبت کم مستحکم اور کم مؤثر ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر غیر معمولی ہنگامی حالات میں ممکن ہے کہ ریاستیں انصاف کے بعض اصولوں یا معاہدات کی مکمل پابندی سے عارضی طور پر انحراف کرنے کا فیصلہ کریں۔

البتہ ہیوم کے نزدیک یہ رعایت صرف غیر معمولی ہنگامی حالات تک محدود ہونی چاہیے۔ اسے بین الاقوامی معاشرے کا معمول یا مستقل طرزِ عمل نہیں بننا چاہیے، کیونکہ ایسا کرنے سے بین الاقوامی نظم و استحکام متاثر ہوگا۔

چنانچہ ہیوم (1998) کا موقف تھا کہ اگرچہ بین الاقوامی قانون (International Law) داخلی قانون کے مقابلے میں نسبتاً کم قوتِ نفاذ رکھتا ہے، تاہم معمول کے حالات میں اس

کا احترام اور اس کی پابندی ریاستوں کے لیے نہایت ضروری ہے، کیونکہ یہی رویہ بین الاقوامی اعتماد، تعاون اور پائیدار نظم کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کے موضوع پر ڈیوڈ ہیوم (David Hume) کا سب سے معروف مضمون "طاقت کا توازن" (Balance of Power) ہے۔ انہوں نے اس تصور کو بین الاقوامی سیاست کا ایک نہایت اہم اور مؤثر اصول قرار دیا، جو عالمی نظم و نسق کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ کسی ایک بڑی طاقت کو عسکری قوت کے ذریعے دیگر ریاستوں پر غلبہ حاصل کرنے سے روکا جائے۔ اس مقصد کے لیے دوسری ریاستیں باہمی اتحاد (Countervailing Coalition) قائم کر کے اس طاقت کا توازن برقرار رکھتی ہیں۔

ہیوم کے نزدیک طاقت کا توازن کوئی پراسرار یا جادوئی تصور نہیں تھا، بلکہ یہ عقلِ سلیم اور منطقی استدلال پر مبنی ایک عملی اصول تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ریاستی رہنماؤں کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اس توازن کو برقرار رکھنے کے لیے سنجیدہ کوشش کریں۔ اگر کوئی حکمران صرف داخلی معاملات پر توجہ دے اور بین الاقوامی طاقت کے توازن کو نظرانداز کر دے تو وہ اپنی ذمہ داری سے غفلت برتتا ہے۔

اگرچہ طاقت کا توازن بین الاقوامی نظم کو برقرار رکھنے اور موجودہ صورتِ حال (Status Quo) کو مستحکم کرنے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے، لیکن ہیوم اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ یہ نظام ہمیشہ مضبوط اور پائیدار نہیں ہوتا۔ بعض اوقات اس کی نازک نوعیت ریاستوں کے درمیان ایسے ردِّ عمل کا سبب بن سکتی ہے جو بالآخر جنگ اور تشدد پر منتج ہو۔ اس کے باوجود ہیوم کا خیال تھا کہ مجموعی طور پر طاقت کا توازن ایک مفید ادارہ ہے، کیونکہ اس کے ذریعے حتیٰ کہ سب سے طاقتور سلطنتوں کو بھی قابو میں رکھا جا سکتا ہے اور ان کے غلبے کو محدود کیا جا سکتا ہے (Hume، 1985)۔

ہیوم جنگ کو پسند نہیں کرتے تھے، اگرچہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے کہ جنگ بین الاقوامی تعلقات کا ایک مستقل اور ناگزیر پہلو ہے (Whelan، 2004)۔ ان کے نزدیک جنگ کو حتی الامکان محدود رکھا جانا چاہیے، لیکن اس کے مکمل خاتمے کی امید رکھنا حقیقت پسندانہ نہیں۔ ان کے مطابق بعض حالات میں جنگ نہ صرف جائز بلکہ ضروری بھی ہو سکتی ہے، مثلاً جب ایک ریاست دوسری ریاست کی آزادی یا خودمختاری کے لیے خطرہ بن جائے۔

فطری قانون (Natural Law) کے نظریے سے اپنی وابستگی کے مطابق ہیوم کا یہ بھی مؤقف تھا کہ جنگ کا منصفانہ (Just War) ہونا ضروری ہے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ جنگ کی کوئی معقول اور اخلاقی طور پر قابلِ جواز وجہ موجود ہو۔ تاہم، ایسے حالات میں بھی حکمرانوں کو جنگ کا فیصلہ کرتے وقت دانش مندی، احتیاط اور دوراندیشی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

ہیوم کے نزدیک معمولی، غیر سنجیدہ یا ذاتی مفادات پر مبنی وجوہات کی بنا پر جنگ چھیڑنا اخلاقی طور پر غلط ہے، کیونکہ جنگ کے فوری نتائج نہایت تباہ کن ہوتے ہیں۔ اس کے اثرات اکثر دیگر ممالک تک پھیل جاتے ہیں، ریاستوں پر بھاری مالی بوجھ عائد کرتے ہیں، اور آزاد تجارت (Free Commerce) کو شدید نقصان پہنچاتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون کے دیگر مفکرین کے مقابلے میں ہیوم نے جنگ کے منفی معاشی، سیاسی اور انسانی اثرات پر کہیں زیادہ زور دیا۔

ڈیوڈ ہیوم (David Hume) کے سلطنتوں (Empires) کے بارے میں خیالات وقت کے ساتھ ارتقا پذیر رہے۔ ابتدا میں وہ یورپی سلطنتوں کو علم، فنون، صنعتوں اور تجارت کے فروغ میں ایک اہم قوت سمجھتے تھے۔ برطانیہ کے تناظر میں وہ اس بات کو بھی مثبت سمجھتے تھے کہ سلطنت نے مواقع کو صرف اشرافیہ (Upper Class) تک محدود رکھنے کے بجائے معاشرے کے وسیع تر طبقات تک پہنچانے میں کردار ادا کیا۔

تاہم، زندگی کے آخری دور میں ہیوم کا نقطۂ نظر زیادہ تنقیدی ہو گیا۔ انہوں نے نوآبادیاتی فتوحات، زمینوں کی ضبطی (Confiscation of Land) اور مقبوضہ علاقوں میں انفرادی

آزادیوں پر قدغن کو تنقید کا نشانہ بنایا۔اس کے باوجود انہوں نے کبھی برطانوی سلطنت کے مکمل خاتمے کا مطالبہ نہیں کیا۔

بعد کے زمانے میں ہیوم کی ترجیح اس امر کی طرف مائل ہوئی کہ ریاستوں کے درمیان خصوصاً امریکی نوآبادیات (American Colonies) کے معاملے میں تعلقات برابری کی بنیاد پر باہمی تبادلے (Exchange on Equal Terms) اور آزادی و خودمختاری (Independence) پر استوار ہوں۔ وہ امریکی آزادی کے ابتدائی حامیوں میں شامل تھے اور امریکہ کے متعدد بانی رہنماؤں (Founding Fathers) سے ان کی خط و کتابت بھی رہی۔

1775ء میں ہیوم نے اپنے بارے میں یہ مشہور الفاظ لکھے:

"اپنے اصولوں کے اعتبار سے، میں ایک امریکی ہوں۔"

(Hume, 1932)

ہیوم کا خیال تھا کہ امریکی آزادی کے نتیجے میں برطانیہ کو نہ تو کوئی بڑا اور مستقل معاشی نقصان اٹھانا پڑے گا اور نہ ہی اس کی جغرافیائی سیاسی حیثیت (Geopolitical Position) کو کوئی فیصلہ کن دھچکا پہنچے گا۔ البتہ انہوں نے یہ تسلیم کیا کہ برطانیہ کی بین الاقوامی ساکھ (Reputation) کو کچھ نقصان پہنچ سکتا ہے، لیکن ان کے نزدیک یہ نقصان ناگزیر تھا، کیونکہ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ امریکیوں کے خلاف جنگ جیتنا ممکن نہیں تھا۔

ہیوم (1985) بین الاقوامی تجارت کے پُرزور حامی تھے۔ ان کے نزدیک تجارت نہ صرف معاشی ترقی کا ذریعہ ہے بلکہ سماجی اور ثقافتی ارتقا میں بھی بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ ان کا استدلال تھا کہ تجارت، ریاست کی عظمت اور اس کے باشندوں کی خوش حالی باہم گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ وہ مجموعی خوش حالی کو بھی عوام کو اشرافیہ کے مقابلے میں زیادہ بااختیار بنانے کا ایک مؤثر ذریعہ تصور

کرتے تھے۔ان کے نزدیک تجارت اور کاروباری سرگرمیاں دولت، قومی وقار اور عسکری قوت کا سرچشمہ بن سکتی ہیں، بشرطیکہ ان کے ساتھ آزاد حکومت اور انفرادی آزادی بھی موجود ہو۔
چونکہ ہیوم درآمدات کو کسی ریاست کی معاشی کمزوری نہیں بلکہ اس کی خوش حالی کی علامت سمجھتے تھے،اس لیے انہوں نے مرکنٹیلزم (Mercantilism) کو، جسے وہ ''تجارت سے حسد'' (Jealousy of Trade)قرار دیتے تھے، سختی سے مسترد کیا۔اسی طرح انہوں نے اس نظریے کو بھی رد کیا کہ کسی ملک کی برتری اس بات میں مضمر ہے کہ اس کی برآمدات کی مالیت درآمدات سے زیادہ ہو،یعنی مثبت تجارتی توازن (Positive Balance of Trade)برقرار رکھا جائے۔ہیوم اس بات کے بھی قائل تھے کہ اقوام کی معیشتیں باہم مربوط ہوتی ہیں؛چنانچہ ایک ملک کی دولت اور خوش حالی میں اضافہ عموماًاس کے پڑوسی ممالک کی معیشت اور تجارت کے فروغ کا بھی باعث بنتا ہے۔
ہیوم نے مزید استدلال کیا کہ بین الاقوامی تجارت اور ریاستی طاقت کے درمیان گہرا تعلق موجود ہے، کیونکہ ایک خوش حال معاشرہ اپنی قومی دفاعی صلاحیتوں پر زیادہ وسائل صرف کرنے کی استطاعت رکھتا ہے۔تاہم، وہ اس تصور سے متفق نہیں تھے کہ تجارت فطری طور پر عالمی امن کو فروغ دیتی ہے، کیونکہ ان کے نزدیک تجارت انسانی فطرت کو تبدیل نہیں کرسکتی۔اگرچہ وہ اسے تجارت کا ایک افسوس ناک پہلو سمجھتے تھے، لیکن ان کا یقین تھا کہ تجارت کے مجموعی فوائد اس کے ممکنہ نقصانات پر نمایاں طور پر غالب ہیں(مینزر،1996)۔
ہیوم اپنے عہد کے نمایاں ترین مفکرین میں شمار ہوتے تھے،اور آج بھی انہیں ایک ایسے معتدل مفکر کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو بین الاقوامی سیاست میں اعتدال اور توازن کے قائل تھے۔ان کے نزدیک ریاستوں پر مشتمل ایک نسبتاً منظم بین الاقوامی معاشرہ ہی انفرادی آزادی کے فروغ کے لیے سب سے موزوں نظام فراہم کرتا ہے۔ان کے داخلی اور بین الاقوامی سیاسی نظریات میں نمایاں ہم آہنگی پائی جاتی تھی،اور دونوں ایک ہی فکری بنیاد پر استوار تھے۔

ہیوم طاقت کی بے لگام سیاست (Power Politics) کے ناقد تھے اور بین الاقوامی تعلقات کو ایسی انتشار پسندانہ کیفیت نہیں سمجھتے تھے جس میں ہر ریاست دوسری ریاست کے خلاف برسرِ پیکار ہو۔ ان کے نزدیک بین الاقوامی قانون، سفارت کاری اور آزاد تجارت ایسے بنیادی ذرائع تھے جو عالمی سطح پر نظم و استحکام کو برقرار رکھنے میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ اس حقیقت پر افسوس کا اظہار کرتے تھے کہ جنگ انسانی معاشرے کی ایک ناگزیر حقیقت ہے، تاہم ان کا اصرار تھا کہ اگر جنگ ناگزیر ہو تو اسے 'منصفانہ جنگ (Just War) ' کے اصولوں اور اخلاقی حدود کے اندر محدود رکھا جانا چاہیے۔

ایڈم سمتھ (1790–1723)

ایڈم سمتھ، ڈیوڈ ہیوم کے مقابلے میں عمر میں کچھ کم تھے، لیکن اپنی بالغ زندگی کے بیشتر حصے میں دونوں کے درمیان گہری دوستی اور فکری رفاقت قائم رہی۔ وہ نہ صرف ایک دوسرے کے علمی کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ متعدد مشترکہ علمی انجمنوں اور کلبوں کے بھی رکن تھے۔
اگرچہ ایڈم سمتھ کو عموماً ایک ماہرِ معاشیات کے طور پر یاد کیا جاتا ہے، لیکن درحقیقت ان کی بنیادی شناخت اخلاقی فلسفے (Moral Philosophy) کے پروفیسر کی تھی۔ بعدازاں انہوں نے ہنری اسکاٹ (Henry Scott)، جو تیسرے ڈیوک آف بکلوچ (3rd Duke of Buccleuch) تھے، کے نجی اتالیق (Private Tutor) کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس تقرری کے دوران انہیں یورپ کا ایک طویل مطالعاتی اور تعلیمی سفر کرنے کا موقع ملا، جسے تاریخ میں عموماً ''گرینڈ ٹور'' (Grand Tour) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سفر کا بیشتر حصہ فرانس میں گزرا۔

اپنی عملی زندگی کے آخری دور میں سمتھ نے کمشنر آف کسٹمز (Commissioner of Customs) کے منصب پر خدمات انجام دیں، جہاں ان کی ذمہ داری حکومت کی جانب سے درآمدی محصولات (Import Duties) کی وصولی تھی۔ آزاد تجارت کے حق میں ان کے مضبوط نظریاتی مؤقف اور شہرۂ آفاق تحریروں کے تناظر میں، ان کا یہ سرکاری منصب ایک دلچسپ تضاد (Irony) محسوس ہوتا ہے۔

سمتھ کے نزدیک دنیا مختلف اقوام یا ممالک پر مشتمل ہے، جن میں سے ہر ایک اپنے جداگانہ قوانین، رسوم و رواج اور مقامی روایات کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ ان کے نزدیک قوم انسانی جذبات اور وابستگی کا ایک فطری مرکز ہے، اور کسی قوم کی عزت و وقار اس کے باشندوں کی عزت و وقار سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

سمتھ کا خیال تھا کہ انسان، خواہ میزبان معاشرے کے لوگ کتنے ہی مہذب، خوش اخلاق اور انسان دوست کیوں نہ ہوں، کسی غیر ملک میں ہمیشہ ایک حد تک اجنبیت اور بے گانگی کا احساس کرتا ہے۔ وہ عالمی شہریت (World Citizenship) کے تصور کو بڑی حد تک ایک غلط فہمی سمجھتے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک انسان کی وابستگیاں چھوٹی سماجی اکائیوں سے کہیں زیادہ مضبوط اور فطری ہوتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں، انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی ترجیحات میں پہلے اپنے خاندان، پھر اپنے دوستوں اور اس کے بعد اپنی قوم کو اہمیت دے۔

سمتھ کے نزدیک وطن سے محبت اور نوعِ انسانی سے محبت دو الگ الگ تصورات ہیں۔ اگرچہ دونوں جذبات اپنی جگہ موجود ہیں، لیکن ان کے خیال میں انسان اپنے وطن سے اس کی اپنی حیثیت میں محبت کرتا ہے، نہ کہ اسے پوری انسانیت پر مشتمل کسی وسیع تر عالمی معاشرے کا محض ایک جزو سمجھ کر۔ سمتھ اس بات کے بارے میں مطمئن نہیں تھے کہ آیا واقعی ایسا کوئی عالمی انسانی معاشرہ وجود رکھتا ہے یا نہیں۔ تاہم، اگر اس کے وجود کو تسلیم بھی کر لیا جائے، تو ان کے نزدیک اس کی بہترین خدمت اسی صورت میں ممکن ہے جب افراد اپنی محبت اور وابستگی کا رخ اپنی مخصوص سماجی اکائی، یعنی اپنی

قوم، کی طرف رکھیں، کیونکہ یہی دائرہ ان کی فہم، صلاحیت اور فطری انسانی وابستگیوں سے مطابقت رکھتا ہے (ملاحظہ ہو باب 6)۔

سمتھ کا خیال تھا کہ آفاقی خیر خواہی (Universal Benevolence) کا تصور انسان کے اپنے وطن سے آگے عملی طور پر توسیع نہیں پا سکتا، تاہم وہ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ نیک نیتی (Goodwill) کی کوئی جغرافیائی حد نہیں ہوتی اور اس کا دائرہ پوری نوعِ انسانی تک بھی پھیل سکتا ہے۔ ان کے نزدیک ایک دانا اور صاحبِ بصیرت انسان کو، اگر ضرورت پیش آئے، تو اپنے ذاتی مفاد کو اپنے وطن کی اجتماعی بھلائی پر قربان کرنے کے لیے آمادہ رہنا چاہیے۔ سمتھ کے مطابق پوری کائنات کا حقیقی منتظم اور نگران صرف خدا ہے، جو تمام عقل رکھنے والی اور احساس سے بہرہ مند مخلوقات کی خوش حالی کا نگہبان ہے۔ اس کے برعکس، انسان کی ذمہ داری محدود ہے؛ اسے بنیادی طور پر اپنی، اپنے خاندان، اپنے دوستوں اور اپنے وطن کی بھلائی کا خیال رکھنا چاہیے (Smith 1982)۔

سمتھ بین الاقوامی سیاست کو تھامس ہابز کے اس تصور کے مطابق نہیں دیکھتے تھے جس میں دنیا ہر ایک کے خلاف ہر ایک کی دائمی جنگ کا میدان ہو۔ ان کے نزدیک بین الاقوامی سطح پر ایک ایسا نظم و نسق قائم کیا جا سکتا ہے جو استحکام اور معاشی کشادگی کو یقینی بنائے، کیونکہ یہی انفرادی آزادی کے تحفظ اور فروغ کا بہترین ذریعہ ہے۔ تاہم، بین الاقوامی قانون کے بارے میں ان کا اعتماد ہیوم کے مقابلے میں کم تھا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ بین الاقوامی قواعد و ضوابط کا وجود مفید ہے، لیکن ان کے نزدیک بین الاقوامی قانون انصاف کے اس بنیادی اصول کو مؤثر طور پر نافذ کرنے میں ناکام رہا کہ صرف جارح یا جنگ چھیڑنے والے فریق کو سزا ملنی چاہیے۔

سمتھ نے مشاہدہ کیا کہ بین الاقوامی قانون کی مکمل پاسداری کے باوجود اکثر ریاستوں کے اصل ذمہ دار حکمران سزا سے بچ نکلتے ہیں، جبکہ اس کے برعکس بے گناہ عوام جنگ کے مصائب کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک حقیقی قصور وار ریاستوں کے قائدین ہوتے ہیں، نہ کہ عام شہری۔

سمتھ کے عہد میں ہیوگو گروشیئس (Hugo Grotius) کی شہرۂ آفاق تصنیف ''حقوقِ جنگ وامن'' (The Rights of War and Peace) بین الاقوامی قانون پر سب سے جامع اور مستند تصنیف سمجھی جاتی تھی، اور آج بھی اسے بین الاقوامی قانون کی تاریخ میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ سمتھ نے گروشیئس کی اس امتیازی تقسیم کو سراہا جس میں انہوں نے قانونِ فطرت (Natural Law) پر مبنی قواعد اور وضعی قانون (Positive Law) پر مبنی قواعد میں فرق کیا تھا۔ تاہم، سمتھ کے نزدیک وضعی قانون کی حیثیت کم تر تھی، کیونکہ بین الاقوامی قانون کے قواعد نہ تو تمام ریاستوں کی متفقہ رضامندی سے وجود میں آتے ہیں اور نہ ہی ان پر سب ریاستیں یکساں طور پر عمل کرتی ہیں۔ اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ قانونِ اقوام (Law of Nations) اکثر اوقات محض دعووں اور رسمی اعلانات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا (Smith 1982)۔

بین الاقوامی قانون کی لازمی حیثیت کے بارے میں اپنے تحفظات کے باوجود، سمتھ کا خیال تھا کہ خود مختار ریاستوں کے حکمرانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بین الاقوامی معاشرے کے مسلمہ اصولوں اور رائج طریقِ کار کو برقرار رکھنے کی حتی الامکان کوشش کریں۔ ان کے نزدیک، سفارت کاری نہ صرف بین الاقوامی تجارت کے تسلسل کو فروغ دینے کا مؤثر ذریعہ تھی بلکہ ریاستوں کے درمیان روابط اور ابلاغ کو ہموار رکھنے کا بھی اہم وسیلہ تھی۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ سفارت کاروں اور ان کی رہائش گاہوں کو حاصل استثنا (Diplomatic Immunity) ایک مقدس اور ناقابلِ تنسیخ اصول ہے۔ البتہ اس کے ساتھ وہ یہ بھی ضروری سمجھتے تھے کہ سفارت کار اپنے میزبان ملک کے آداب، قوانین اور حساسیتوں کا احترام کریں اور ایسے کسی طرزِ عمل سے گریز کریں جو میزبان ریاست کے لیے باعثِ رنجش ہو۔

سمتھ کے نزدیک، جیسے جیسے بین الاقوامی تجارت کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے، مؤثر سفارتی ذرائع کی اہمیت بھی بڑھتی جاتی ہے، کیونکہ یہی ذرائع ممکنہ تجارتی تنازعات اور باہمی غلط فہمیوں کو کم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ہیوم کی طرح ایڈم سمتھ بھی بین الاقوامی نظام میں طاقت کے توازن (Balance of Power) کو امن واستحکام کے قیام کے لیے ناگزیر سمجھتے تھے، اگرچہ انہوں نے اس موضوع پر ہیوم کے مقابلے میں نسبتاً کم تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے (Van de Haar 2013) ۔

ایڈم اسمتھ، ہیوم کی طرح، جنگ کو بین الاقوامی زندگی کا ایک فطری اور ناگزیر پہلو سمجھتے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک انسانی ہمدردی (sympathy) کا دائرہ لا محدود نہیں ہو سکتا۔ در حقیقت، اسمتھ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف دولتِ اقوام (The Wealth of Nations) میں قومی دفاع، عسکری تنظیم اور حب الوطنی و عسکری اوصاف (patriotic and military virtues) پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اپنے عہد میں ملیشیاؤں (Militias) اور مستقل پیشہ ور افواج (Standing Armies) کے درمیان جاری مباحث میں، انہوں نے اپنے بہت سے دوستوں اور ہم عصر دانش وروں کے برعکس مستقل پیشہ ور فوج کے حق میں موقف اختیار کیا۔

سمتھ تقسیمِ کار (Division of Labour) اور تخصص (Specialization) کے اصولوں کے مضبوط حامی تھے۔ ان کے نزدیک ملیشیا، جو جز وقتی اور غیر پیشہ ور سپاہیوں پر مشتمل ہوتی ہے اور جنہیں باقاعدہ تربیت حاصل نہیں ہوتی، پیشہ ور مستقل افواج کا مؤثر متبادل نہیں بن سکتی۔ ان کا استدلال تھا کہ ریاست کا دفاع ایسے تربیت یافتہ اور ماہر سپاہیوں کے سپرد ہونا چاہیے جو عسکری فنون میں مہارت رکھتے ہوں، خصوصاً ایسے دور میں جب آتشیں اسلحہ اور دیگر ہتھیار تیزی سے زیادہ پیچیدہ اور جدید ہوتے جا رہے ہوں۔ اس لیے قومی سلامتی کا تقاضا یہی ہے کہ دفاعی ذمہ داریاں پیشہ ور، منظم اور اعلیٰ تربیت یافتہ فوج کے سپرد کی جائیں، نہ کہ غیر مستقل اور محدود تربیت یافتہ رضاکار دستوں کے۔

منصفانہ جنگ (Just War) کے اصول کے مطابق، ایڈم اسمتھ کا عقیدہ تھا کہ جنگ کو حتی الامکان محدود رکھا جانا چاہیے اور اس کا آغاز صرف اسی صورت میں جائز قرار دیا جا سکتا ہے جب اس

کے لیے مضبوط اخلاقی جواز موجود ہو۔ ان کے نزدیک انصاف کا بنیادی تقاضا یہ تھا کہ "دوسروں کے ساتھ نقصان دہ یا ظالمانہ طرزِ عمل سے اجتناب کیا جائے" (اسمتھ، 1982)۔

سمتھ کے مطابق، جس طرح ملکی عدالت میں کسی مقدمے کے لیے معقول قانونی بنیاد درکار ہوتی ہے، اسی طرح جنگ بھی صرف واضح اور منصفانہ اسباب کی بنا پر لڑی جانی چاہیے۔ اس سلسلے میں وہ ہیوگو گروشیئس (Grotius) کے پیش کردہ منصفانہ جنگ کے اصولوں سے بڑی حد تک متفق تھے۔ ان کے نزدیک جنگ کے جائز اسباب میں دوسرے ملک کی جانب سے جائیداد کے حقوق کی خلاف ورزی، کسی ریاست کے شہریوں کا قتل، شہریوں کو انصاف تک رسائی کے بغیر قید کرنا، ریاستی سرحدوں یا خودمختاری کی پامالی، واجب الادا قرضوں کی مسلسل عدم ادائیگی، معاہدوں کی خلاف ورزی، سازشوں کا ارتکاب، یا کسی ریاست کے خلاف طاقت کے استعمال کی دھمکی شامل تھے۔

اسمتھ کا یہ بھی مؤقف تھا کہ اگر جنگ ناگزیر ہو جائے تو اس کے دوران اختیار کیے جانے والے اقدامات بھی اخلاقی اصولوں کے تابع ہونے چاہییں۔ بالخصوص، عام شہریوں (Civilians) کو انتقامی کارروائیوں اور جنگی تشدد سے ہر ممکن تحفظ فراہم کیا جانا چاہیے۔

چونکہ جنگ ریاست پر بھاری مالی بوجھ ڈالتی ہے، اس لیے سمتھ نے تجویز دی کہ جنگی اخراجات قرض لے کر پورے کرنے کے بجائے براہِ راست عوام پر عائد کیے گئے ٹیکسوں کے ذریعے پورے کیے جائیں، تاکہ لوگ جنگ کی حقیقی قیمت کو خود محسوس کریں۔ ان کے خیال میں اس طریقۂ کار سے جنگوں کے آغاز میں احتیاط برتی جائے گی اور ان کی مدت اور وسعت بھی محدود رہے گی۔

تاہم، اسمتھ جنگ کو ہر اعتبار سے سراسر منفی نہیں سمجھتے تھے۔ اگرچہ وہ جنگ کی حمایت نہیں کرتے تھے، لیکن ان کا خیال تھا کہ بعض اوقات جنگ بلند حوصلہ اور بلند عزائم رکھنے والے افراد کے لیے کردار سازی (Character Building) کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔ ان کے نزدیک جنگ انسان کو موت کے خوف پر قابو پانے کی تربیت دیتی ہے اور پیشہ ور سپاہیوں میں ضبطِ نفس (-Self

(command) جیسی نہایت اہم اخلاقی صفت کو پروان چڑھاتی ہے، جو ان کے نزدیک اعلیٰ کردار کی بنیادی خصوصیات میں سے ایک تھی۔

ایڈم سمتھ کو بالخصوص آزاد تجارت (Free Trade) کے حق میں مضبوط دلائل پیش کرنے اور مرکنٹلزم (Mercantilism) کی مؤثر تردید کرنے کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک آزاد منڈی اور آزاد تجارت ہر فرد کو اپنی معاشی حالت بہتر بنانے کے بہترین مواقع فراہم کرتی ہیں۔ اس کے برعکس، وہ حکومتی ضابطہ بندی (Government Regulation) اور ایسی معاشی پالیسیوں کو، جن کا مقصد دوسرے ممالک کو معاشی نقصان پہنچا کر خود فائدہ حاصل کرنا ہو—جسے "اپنے پڑوسی کو کنگال کرو" (Beggar-thy-Neighbor) کی پالیسی کہا جاتا ہے—نہ صرف غلط بلکہ مجموعی خوشحالی کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ سمتھ نے واضح کیا کہ آزاد تجارت کوئی "زیرو سم گیم" (Zero-Sum Game) نہیں، جس میں ایک فریق کا فائدہ لازماً دوسرے کے نقصان پر منحصر ہو، بلکہ اس سے تمام شریک فریق باہمی طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔ ان کے بقول، مجموعی طور پر بادشاہوں اور حکمرانوں کے احمقانہ عزائم بھی اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا تاجروں اور صنعت کاروں کے مفاد پرستانہ دباؤ اور تحفظ پسندانہ رجحانات معاشرے کی فلاح و بہبود کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک ہر ملک کی عوام کی اکثریت کے مفاد کا تقاضا یہی ہے کہ انہیں تجارت اور کاروبار کی سرگرمیوں میں آزادانہ اور بلا رکاوٹ شرکت کے مساوی مواقع میسر ہوں۔

تاہم، سمتھ نے یہ بھی تسلیم کیا کہ بین الاقوامی تجارت بین الاقوامی استحکام پر بعض منفی اثرات بھی مرتب کر سکتی ہے۔ ان کے نزدیک، جب قومی ریاستیں تجارت کے ذریعے زیادہ خوشحال ہو جاتی ہیں تو وہ جدید عسکری ساز و سامان حاصل کرنے، بڑی افواج برقرار رکھنے اور بیرونی جنگوں میں حصہ لینے کے لیے زیادہ وسائل کی حامل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ، اگر بین الاقوامی نظام میں امن و استحکام

برقرار نہ رہے تو انفرادی آزادی کے فروغ کے مواقع بھی محدود ہو جاتے ہیں۔ اسی حقیقت کو سمتھ نے ان الفاظ میں بیان کیا کہ "دفاع، خوشحالی سے زیادہ اہم ہے" (Smith, 1981) ۔

سمتھ کو امید تھی کہ سفارت کاری اور عسکری قوت کی مشترکہ کوششیں بین الاقوامی تجارت کے لیے ایک پُرامن اور مستحکم ماحول کو یقینی بنائیں گی۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ تجارت مختلف اقوام کے درمیان ثقافتی تبادلے کو فروغ دیتی ہے، جو باہمی تعلقات کو مضبوط بنانے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود، وہ یہ سمجھتے تھے کہ تجارتی ترقی کا دور بھی جنگ سے مکمل طور پر خالی نہیں ہو سکتا؛ بلکہ اس میں بھی وقتاً فوقتاً جنگوں کا وقوع ایک ناگزیر حقیقت رہے گا۔

ایڈم سمتھ نے اپنے "نظامِ فطری آزادی" (System of Natural Liberty) کا اطلاق بین الاقوامی سیاست اور معیشت پر بھی کیا۔ وہ سامراج، نوآبادیاتی نظام اور غلامی کے سخت ناقد تھے، خواہ معاملہ امریکی نوآبادیات کا ہو یا دنیا کے کسی اور خطے کا۔ ان کے نزدیک یورپی سلطنتوں کی بنیاد ہی بنیادی طور پر ناانصافی، جبر اور سیاسی حماقت پر استوار تھی۔

سمتھ نے برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی (British East India Company) اور ڈچ یونائیٹڈ ایسٹ انڈیز کمپنی (Dutch United East Indies Company) جیسی مراعات یافتہ تجارتی کمپنیوں کو اجارہ داری پر مبنی ایسے ادارے قرار دیا جو مقامی آبادی کا معاشی استحصال کرتے اور ان پر ظلم و ستم روا رکھتے تھے۔ ان کے بقول، ان کمپنیوں کی حکمرانی عسکری قوت کے بل پر قائم تھی اور ان کے انتظامی ڈھانچے میں بدعنوانی عام تھی۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ کم تنخواہ پانے والے سرکاری اہلکاروں کو اپنے ذاتی تجارتی مفادات کے حصول کی اجازت دی جاتی تھی، جس سے اختیارات کے ناجائز استعمال اور بدعنوانی کو فروغ ملتا تھا۔

سمتھ کا خیال تھا کہ اگرچہ برطانوی سلطنت دیگر نوآبادیاتی طاقتوں کے مقابلے میں نسبتاً کم جابرانہ تھی، کیونکہ اس کے بعض قوانین فطری آزادی کے اصولوں سے کسی حد تک ہم آہنگ تھے، تاہم وہ نوآبادیاتی نظام کو اصولی طور پر ناجائز ہی سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک سلطنتوں کو برقرار رکھنا نہایت

مہنگا اور غیر مؤثر عمل تھا، جبکہ نو آبادیات کا قیام بالآخر اس میں شامل تمام فریقوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا تھا۔

انہی بنیادوں پر اسمتھ امریکی نو آبادیات کی آزادی کے حامی تھے۔ انہوں نے لکھا:

"برطانیہ کے حکمرانوں نے ایک صدی سے زیادہ عرصے تک عوام کو اس تصور سے بہلائے رکھا کہ بحرِ اوقیانوس کے مغرب میں ان کی ایک عظیم سلطنت قائم ہے، حالانکہ حقیقت میں یہ سلطنت زیادہ تر محض ایک تصور ہی رہی ہے۔" (سمتھ، 1981)

سمتھ نے امریکہ اور برطانیہ کے درمیان ایک وفاقی اتحاد (Federal Union) کا تصور بھی پیش کیا، لیکن حقیقت پسندانہ انداز میں یہ اعتراف کیا کہ ایسا انتظام برطانوی حکمران طبقے کے قومی وقار اور سیاسی نفسیات سے مطابقت نہیں رکھتا، اس لیے اس کے عملی جامہ پہننے کے امکانات نہایت محدود تھے۔

مختصراً، بین الاقوامی امور کے بارے میں ایڈم اسمتھ کا نظریہ نہایت واضح، مربوط اور فکری طور پر منظم تھا۔ ان کے نزدیک بین الاقوامی سیاست بنیادی طور پر انسانی عمل اور انسانی فطرت کا مظہر ہے، اس لیے اس میں انسانی رویّوں کی تمام مثبت اور منفی جہتیں نمایاں ہوتی ہیں۔

بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں اسمتھ کا نقطۂ نظر بڑی حد تک ڈیوڈ ہیوم کے افکار سے ہم آہنگ تھا۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے کہ جنگ بین الاقوامی زندگی کا ایک وقفے وقفے سے رونما ہونے والا اور کسی حد تک ناگزیر مظہر ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ریاستوں پر مشتمل ایک منظم بین الاقوامی معاشرے کے حامی تھے، جو بین الاقوامی نظم واستحکام اور فطری آزادی کے تحفظ کو ممکن بنا سکے۔ اسی طرح، اگرچہ وہ آزاد تجارت کے پُرجوش حامی تھے، لیکن ان کا یہ بھی اصرار تھا کہ آزاد تجارت بذاتِ خود امن کی ضمانت نہیں بن سکتی۔ مزید برآں، وہ عمومی طور پر سامراجی سلطنتوں اور غلامی، دونوں کے سخت مخالف تھے۔

چوتھا باب

آسٹرین مکتبِ فکر: لڈوگ وون میزس اور ایف۔ اے۔ ہائیک

لبرل فکر کی تاریخ میں انیسویں صدی کے دوسرے نصف اور بیسویں صدی کے آغاز، خصوصاً پہلی جنگِ عظیم سے قبل کے عرصے میں، متعدد ممالک میں کلاسیکی لبرل ازم (Classical Liberalism) بتدریج زوال پذیر ہوا، جبکہ سماجی لبرل ازم (Social Liberalism) کو فروغ حاصل ہوا۔ تاہم، اس عمومی رجحان کے برعکس، 1880ء کی دہائی کے اواخر میں ویانا میں ایک اہم فکری روایت نے جنم لیا، جب کارل مینگر (Carl Menger) نے اس مکتبِ فکر کی بنیاد رکھی جو بعد ازاں معاشیات کے آسٹرین مکتبِ فکر (Austrian School of Economics) کے نام سے معروف ہوا۔

اس روایت کو بعد میں یوجین وون بوہم-باورک (Eugen von Böhm-Bawerk) اور فریڈرک وون وائزر (Friedrich von Wieser) نے مزید استحکام بخشا۔ اس مکتبِ فکر کی تیسری نسل میں لڈوگ وون میزس (Ludwig von Mises) کو اس کے نمایاں ترین مفکرین میں شمار کیا جاتا ہے، جبکہ ان کے افکار نے چوتھی نسل پر گہرا اثر ڈالا، جس کے سب سے معروف نمائندہ فریڈرک آگسٹ وون ہائیک (F. A. Hayek) تھے۔

اگرچہ آسٹرین مکتبِ فکر کے مفکرین کی بنیادی توجہ معاشیات پر مرکوز تھی، لیکن ان کی فکری دلچسپی صرف معاشی مسائل تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ انسانی معاشرے، سیاست، قانون اور بین الاقوامی

معاملات جیسے وسیع موضوعات کا بھی احاطہ کرتی تھی۔ میزس کے نزدیک معاشیات دراصل انسانی عمل (Human Action) کے ایک وسیع تر علم کا حصہ تھی، جسے انہوں نے ''پریکسیولوجی'' (Praxeology) کا نام دیا (میزس، 1996)۔ ان کے مطابق یہ علم صرف محدود وسائل کی تقسیم سے متعلق روایتی معاشی مباحث تک محدود نہیں رہتا، بلکہ انسانی اعمال و فیصلوں کے عمومی اصولوں کو بھی اپنے دائرۂ مطالعہ میں شامل کرتا ہے۔

اسی بناپر، یہ وسیع تر نظریاتی فریم ورک حکومت، سماجی نظم اور انسانوں کے باہمی بقائے باہمی کے اصولوں پر غور کرنے کا متقاضی ہے، خواہ یہ تعلقات قومی سطح پر ہوں یا بین الاقوامی سطح پر۔ اس طرح، آسٹرین مکتبِ فکر نے معاشیات کو بین الاقوامی تعلقات اور سیاسی فلسفے سے جوڑتے ہوئے کلاسیکی لبرل فکر کو ایک جامع نظریاتی بنیاد فراہم کی۔

لڈوگ وون میزس (1881–1973)

دو عالمی جنگوں کے درمیانی عرصے میں لڈوگ وون میزس ویانا کے ممتاز اور بااثر ماہرینِ معاشیات میں شمار ہوتے تھے۔ وہ ویانا چیمبر آف کامرس سے وابستہ تھے اور اس کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی آف ویانا میں پرائیویٹ ڈوزنٹ (Privatdozent) کی حیثیت سے بلا معاوضہ تدریسی خدمات بھی انجام دیتے تھے۔ وہ نہایت زود نویس (Prolific) اور کثیر التصانیف مفکر تھے، جنہوں نے متعدد اہم علمی و فکری تصانیف یادگار چھوڑیں۔ ان کے زیرِ تربیت کئی ایسے شاگرد پروان چڑھے جو بعد میں علمی، معاشی اور سیاسی حلقوں میں نمایاں مقام کے حامل بنے۔

نیشنل سوشلزم (نازی ازم) کے عروج کے باعث، میزس کو بھی اپنے بہت سے شاگردوں کی طرح یورپ چھوڑ کر امریکہ ہجرت کرنا پڑی۔ وہ نیویارک شہر میں آباد ہوئے، جہاں انہوں نے اپنی تدریسی اور علمی سرگرمیوں کا از سرِ نو آغاز کیا۔

میزس نے بین الاقوامی تعلقات کے موضوع پر دو اہم کتابیں تصنیف کیں : نیشن، اسٹیٹ اینڈ اکانومی (Nation, State and Economy) اور اومنی پوٹنٹ گورنمنٹ (Omnipotent Government)۔اس کے علاوہ، انہوں نے اپنے متعدد مضامین اور دیگر تصانیف میں بھی بین الاقوامی سیاست، ریاست، قومیت اور عالمی نظم سے متعلق اہم مباحث پیش کیے، جن سے ان کے بین الاقوامی امور کے بارے میں نظریات کی جامع تصویر سامنے آتی ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں لڈوگ وون میزس کے افکار میں قوم (Nation) کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔آسٹریا کی کثیر القومی سلطنت میں پرورش پانے کے باعث، یہ فطری تھا کہ وہ قوم کو محض جغرافیائی حدود یا نسلی رشتوں کی بنیاد پر نہیں، بلکہ بنیادی طور پر لسانی برادری (Speech Community) کے طور پر سمجھتے تھے۔ان کے نزدیک قومیت کی اصل بنیاد مشترک زبان تھی، اگرچہ وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتے تھے کہ جغرافیہ اور دیگر عوامل بھی قومی شناخت کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔

میزس کا خیال تھا کہ ایک مشترک زبان افراد کو ایک قوم کی صورت میں باہم مربوط کرتی ہے، تاہم وہ "قومی کردار" (National Character) کے تصور کو قبول نہیں کرتے تھے۔ان کے نزدیک قوموں کے لیے کوئی مستقل یا موروثی نفسیاتی یا اخلاقی کردار فرض کرنا درست نہیں تھا۔ میزس کے مطابق، قوم پرستی (Nationalism) بعض حالات میں آزاد خیال (Liberal) اور امن پسند (Pacifist) بھی ہو سکتی ہے، بالخصوص اس وقت جب قوم اور ریاست کی سرحدیں ایک دوسرے سے مطابقت رکھتی ہوں، جیسا کہ ان کے زمانے میں فرانس اور برطانیہ کی مثالیں پیش کی جا سکتی تھیں۔ایسے حالات میں قوم پرستی دیگر اقوام کے خلاف جارحیت یا دشمنی کا باعث نہیں بنتی، بلکہ قومی خود مختاری اور داخلی ہم آہنگی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اس کے برعکس، میزس نے اس قوم پرستی سے خبردار کیا جو جارحانہ، عسکریت پسند اور سامراجی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ان کے نزدیک یہ رجحان عموماً ان خطوں میں جنم لیتا ہے جہاں مختلف قومیں اور نسلی گروہ ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط آبادی کی صورت میں آباد ہوں، جیسا کہ مشرقی یورپ میں دیکھا جا سکتا تھا۔

میزس کا خیال تھا کہ قوم پرستی کے اس منفی اور خطرناک پہلو کا مؤثر علاج حقِ خود ارادیت (Self-Determination) کو زیادہ سے زیادہ وسعت دینے میں مضمر ہے۔ ان کے نزدیک اگرچند لاکھ افراد پر مشتمل کوئی قومی گروہ بھی اپنی الگ قومی شناخت رکھتا ہو، تو اسے اپنی خود مختار ریاست قائم کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

البتہ، اس نظریے پر شدید تنقید بھی کی گئی۔ ناقدین کا استدلال تھا کہ اگر میزس کے تصورِ حقِ خود ارادیت کو مکمل طور پر نافذ کر دیا جائے تو دنیا بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو جائے گی، جس کے نتیجے میں سرحدی تنازعات، باہمی مداخلت، جغرافیائی سیاست (Geopolitics) کی کشمکش اور مذہبی اختلافات مزید شدت اختیار کر سکتے ہیں۔ بعض ناقدین نے تو یہاں تک کہا کہ میزس کا یہ تصور بالآخر بین الاقوامی نظام کو انتشار (Anarchy) کی طرف دھکیل سکتا ہے۔

مزِس (Mises) نے جنگ کے موضوع پر مستقل طور پر لکھا اور اظہارِ خیال کیا، جس کی ایک اہم وجہ پہلی جنگِ عظیم کے دوران بطور فوجی افسران کے ذاتی تجربات تھے۔ ان کی بعض تحریروں سے بظاہر یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ امن پسندی (Pacifism) کی جانب مائل تھے، لیکن وقت کے ساتھ ان کے خیالات میں نمایاں تبدیلی آئی اور ان کا موقف نسبتاً زیادہ سخت ہوتا گیا۔ مثال کے طور پر، دوسری جنگِ عظیم کے دوران وہ ان ریاستوں کے سخت ناقد تھے جنھوں نے غیر جانب دار رہنے کی پالیسی اختیار کی، کیونکہ ان کے نزدیک ایسی غیر جانب داری عملاً نیشنل سوشلزم (Nazism) کی بالواسطہ تائید کے مترادف تھی۔

اسکاٹش مفکرین کی طرح مزِس بھی جنگ کو انسانی زندگی کا ایک گہرا اور فطری مظہر سمجھتے تھے۔ اگرچہ ان کے نزدیک مخصوص گروہوں، طبقات، نسلوں یا اقوام کے درمیان جنگ کوئی ناگزیر حقیقت نہیں تھی، تاہم وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ جنگ کبھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوگی، کیونکہ اس کے ممکنہ اسباب بے شمار ہیں۔ ان کے نزدیک جنگ کے محرکات ہمیشہ عقلی نہیں ہوتے؛ مذہبی اختلافات یا قوم پرستانہ جذبات کی بنیاد پر لڑی جانے والی جنگیں اکثر ایسی ہوتی ہیں جن میں مفاہمت کی حقیقی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔

مزِس نے اس تنقید کو بھی مسترد کیا کہ حقِ خود ارادیت کی بنیاد پر آسانی سے علیحدگی (secession) کی ان کی تجویز جنگ کے امکانات میں اضافہ کرے گی۔ اسی طرح وہ امن پسندوں (Pacifists) کے اس مؤقف سے بھی متفق نہیں تھے کہ جنگ سے کسی بھی فریق کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان کے نزدیک عسکری ساز و سامان کی خرید و فروخت آزاد منڈی کے اصولوں کے تحت ہونی چاہیے، اور دورانِ جنگ بھی معیشت کو مرکزی منصوبہ بندی کے تابع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

مزِس کا استدلال تھا کہ اسلحہ سازی کی صنعت جنگ کا سبب نہیں بنتی بلکہ وہ محض حکومتوں کی طلب کے مطابق ردِ عمل ظاہر کرتی ہے۔ ان کے نزدیک اقوام اسلحہ ساز صنعت کے مفادات کی وجہ سے جنگجو نہیں بنتیں۔ اس اعتبار سے ان کا نقطۂ نظر امریکہ کے بعض سماجی اور معاشی لبرلز سے نمایاں طور پر مختلف تھا، جو اس امر سے خبردار کرتے تھے جسے بعد میں صدر آئزن ہاور (Eisenhower) نے "فوجی صنعتی اتحاد" (Military-Industrial Complex) کا نام دیا۔

جنگ کے متعدد اسباب سے آگاہ ہونے کے باوجود، مزِس (Mises) نے اس مسئلے کا حل بنیادی طور پر معاشی نقطۂ نظر سے پیش کیا۔ اس یک رخی توجہ کے باعث بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں ان کا نظریہ کسی حد تک محدود دکھائی دیتا ہے۔ ان کی توجہ خاص طور پر معاشی قوم پرستی

(Economic Nationalism)اور تحفظ پسندی (Protectionism) پر مرکوز تھی، جبکہ وہ بین الاقوامی سطح پر محنت کی تقسیم (Division of Labour) کو ان مسائل کا مؤثر علاج سمجھتے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ آخر کار لوگ اس حقیقت کا ادراک کر لیں گے کہ ان کے حقیقی مفادات بلا رکاوٹ بین الاقوامی لین دین، بالخصوص آزاد تجارت اور مالیاتی تبادلوں، میں مضمر ہیں۔

آزاد تجارت کے حق میں ان کی حمایت تقریباً غیر مشروط تھی، جس میں افرادی قوت کی آزادانہ نقل و حرکت بھی شامل تھی۔ مزِس انسانی تاریخ کو پُر امن آزاد تجارت اور عسکریت پسند سامراجیت کے درمیان ایک مسلسل کشمکش کے طور پر دیکھتے تھے، لیکن ان کے نزدیک افسوسناک حقیقت یہ تھی کہ عملی سیاست میں اکثر عسکریت پسند سامراجیت ہی غالب آتی رہی۔ اس کے باوجود، وہ اس امید سے دست بردار نہیں ہوئے کہ ایک دن کلاسیکی لبرل ازم کے اصولوں پر مبنی ان کا تجویز کردہ نظام ضرور نافذ ہو گا۔ اس اعتبار سے وہ ہمیشہ ایک مثالی پسند (Idealist) مفکر رہے۔

مزِس (Mises) نظریۂ منصفانہ جنگ (Just War Tradition) کے حامی تھے، لیکن ''قانونِ فطرت'' (Natural Law) کی اصطلاح سے ان کی ناپسندیدگی نے انہیں اس روایت کو کھلے عام قبول کرنے سے باز رکھا۔ ان کا مؤقف تھا کہ دفاعِ ذات (Self-defence) کے لیے لڑی جانے والی جنگ منصفانہ ہوتی ہے۔ وہ اس بات کو اطمینان کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ حتیٰ کہ سب سے طاقتور حکمران بھی جنگ کے آغاز کے لیے کسی نہ کسی منصفانہ جواز کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک منصفانہ جنگ کی روایت نے اس تصور کو فروغ دیا کہ جنگ معمول کے بجائے ایک استثنائی صورتِ حال ہونی چاہیے۔

امن کے زمانے میں مزِس ایسے بین الاقوامی قانون کے حامی تھے جو معاشی معاملات میں یکساں اور منصفانہ مسابقتی ماحول (Level Playing Field) قائم کرنے کے لیے قومی قوانین پر

فوقیت رکھتا ہو۔ تاہم، وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ بین الاقوامی قانون، عوامی قانون (Public Law) کی نسبتاً کم ترقی یافتہ اور ناپختہ شاخوں میں سے ایک ہے۔

ابتدا میں مزِس (Mises) کا خیال تھا کہ بین الاقوامی سیاست میں طاقت کے توازن (Balance of Power) کا تصور اپنی افادیت کھو چکا ہے۔ تاہم، دوسری جنگِ عظیم کے دوران ان کے اس مؤقف میں تبدیلی آئی، اور انہوں نے یورپی سیاست میں دو متوازن حریف بلاکوں ایک مغربی بلاک اور دوسرا مشرقی جمہوری اتحاد کے قیام کی تجویز پیش کی (مزِس 2000؛ وان ڈی ہار 2022)۔ ان کے نزدیک یورپ اور دنیا کی تعمیرِ نو اور مغربی تہذیب کے تحفظ کے مقاصد میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کا یہی واحد معقول راستہ تھا۔ چونکہ یہ خیالات انہوں نے 1941ء میں قلم بند کیے تھے، اس لیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے سرد جنگ کے دوران یورپ کی آئندہ تقسیم کا پیشگی ادراک کر لیا تھا۔

مزِس نے امریکہ پر زور دیا کہ وہ جنگ سے قبل اختیار کی گئی اپنی تنہائی پسندی (Isolationism) کی پالیسی ترک کرے اور ایک آزاد، پُرامن اور قواعد پر مبنی عالمی نظام کے قیام میں قائدانہ کردار ادا کرے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ نہ صرف دنیا بلکہ خود امریکہ کے مفاد میں بھی تھا۔ ان کا استدلال تھا کہ دنیا کے دیگر حصوں میں پیش آنے والے واقعات سے امریکہ خود کو الگ نہیں رکھ سکتا؛ لہٰذا عالمی حالات میں رونما ہونے والی ہر بڑی تبدیلی امریکہ کے لیے بھی ناگزیر طور پر اہم اور باعثِ تشویش ہوگی۔

مزِس (Mises) لیگ آف نیشنز (League of Nations) پر تنقید کرتے تھے، جس کی ایک وجہ اس کی ایک کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے ان کا ذاتی تجربہ بھی تھا۔ 1919 ہی میں انہوں نے اس کے ناکام ہونے کی پیش گوئی کر دی تھی، کیونکہ ان کے نزدیک یہ ادارہ طاقت کے بل پر قائم کیا گیا تھا، اس کی تنظیمی ساخت کمزور تھی، اور اس کی فکری بنیاد لبرل ازم پر استوار نہیں تھی۔ مزید برآں، امریکہ بھی اس کا رکن نہیں تھا۔ تاہم، مزِس نے لیگ آف نیشنز کی بعض مفید خدمات

مثلاً متعدی امراض کی روک تھام، غیر قانونی منشیات کی تجارت اور جسم فروشی کے خلاف اقدامات، بین الاقوامی شماریاتی بیورو کے طور پر اس کی خدمات، نیز بین الاقوامی دانشورانہ املاک کے حقوق (Intellectual Property Rights) کے شعبے میں اس کی پیش رفت کا اعتراف بھی کیا۔

جہاں تک اقوامِ متحدہ (United Nations) اور دیگر بین الاقوامی تنظیموں کا تعلق ہے، مزِس نے لکھا کہ: ''فتح و تسخیر کی روح کو بین الاقوامی تنظیموں، معاہدوں اور عہد ناموں کی سرخ فیتہ شاہی کے ذریعے دبایا نہیں جا سکتا'' (مزِس 1996)۔ ان کے نزدیک عالمی حکومت (World Government) کا منطقی انجام عالمی سوشلزم کی صورت میں برآمد ہو گا۔ تاہم، وہ اقوام کی ایک مشترکہ دولتِ مشترکہ (Commonwealth of Nations) کے تصور کے لیے آمادہ تھے، بشرطیکہ وہ عالمی سطح پر مرکزی منصوبہ بندی کرنے والے ادارے (Global Central Planner) یا ایک وحدانی عالمی حکومت (Unitary Government) کی شکل اختیار نہ کرے۔

اگرچہ ابتدا میں مزِس (Mises) کلیرنس اسٹریٹ (Clarence Streit) کی جانب سے پیش کیے گئے بحرِ اوقیانوس کے آر پار پھیلی ہوئی مغربی جمہوریتوں کے وفاقی اتحاد کے منصوبے سے متفق نہیں تھے، لیکن دوسری جنگِ عظیم کے عروج کے دوران انہوں نے اس اور اس نوعیت کے دیگر منصوبوں کی حمایت کرنا شروع کر دی۔ خصوصاً 1940 کی دہائی میں مزِس مغربی اور مشرقی یورپ کے انضمام سے متعلق تجاویز کے بارے میں پہلے کی نسبت زیادہ مثبت مؤقف اختیار کر گئے۔ امریکہ منتقل ہونے کے بعد انہوں نے 'پین-یورپین موومنٹ (Pan-European Movement)' کی ایک کمیٹی میں بھی خدمات انجام دیں۔

اسی تناظر میں انہوں نے اپنی کتاب Omnipotent Government میں مغربی جمہوریتوں کے ایک وفاقی اتحاد کی وکالت کی، تاکہ یورپ کو دوبارہ انحطاط اور تباہی کے راستے پر جانے سے روکا جا

سکے۔ تاہم، ان کے نزدیک یہ اتحاد اسی صورت میں قابلِ قبول تھا جب وہ مضبوط معاشی اصولوں پر استوار ہو، معاشی قوم پرستی سے پاک ہو، تجارتی رکاوٹوں سے مبرا ہو اور اس میں سرکاری افسر شاہی (بیوروکریسی) کی غیر ضروری مداخلت شامل نہ ہو۔ انہی اصولی وجوہات کی بنا پر انہوں نے 'مارشل پلان (Marshall Plan) 'کی مخالفت کی، کیونکہ ان کے خیال میں یہ امریکی ٹیکس دہندگان کے وسائل کو مختلف مداخلت پسندانہ (interventionist) منصوبوں پر غیر مؤثر انداز میں صرف کرنے کی ایک مثال تھا۔

مزِس نے مشرقی یورپی اقوام پر مشتمل ایک 'مشرقی جمہوری اتحاد (Eastern Democratic Union)' کا تصور بھی پیش کیا، جو عملی طور پر ایک بڑی وحدانی ریاست (Unitary State) کی صورت اختیار کرتا۔ بظاہر یہ مؤقف ان کے پہلے کے اس نظریے سے متصادم دکھائی دیتا ہے جس میں وہ علیحدگی (Secession) اور حقِ خود ارادیت کے مضبوط حامی تھے۔ تاہم، غالباً اس تبدیلی کی وجہ دوسری جنگِ عظیم کی ہولناک تباہ کاریوں کا تجربہ اور یہ یقین تھا کہ جنگ سے قبل مشرقی یورپ کا سیاسی بندوبست ناکام ثابت ہو چکا تھا، کیونکہ وہاں موجود متعدد اقوام اور نسلی اقلیتیں نہ صرف کلاسیکی لبرل اصولوں کے مطابق ایک مشترکہ سیاسی نظام قائم رکھنے میں ناکام رہیں بلکہ باہمی امن اور پُرامن بقائے باہمی کو بھی برقرار نہ رکھ سکیں (Van de Haar 2022)۔

یہ بات باعثِ حیرت نہیں کہ مزِس (Mises) سامراجیت کے سخت مخالف تھے، کیونکہ ان کے نزدیک سامراج درحقیقت ایک اجتماعیت پسند (collectivist) پالیسی تھی، جو نوآبادیات کے باشندوں کو اپنی ذات میں مقصد (ends) نہیں بلکہ محض ایک ذریعہ (means) سمجھتی تھی۔ اسی طرح وہ ان سابق نوآبادیات کو، جو آزادی حاصل کر کے نئی خودمختار ریاستیں بن چکی تھیں، ترقیاتی امداد (development aid) فراہم کرنے کے بھی مخالف تھے۔ ان کے نزدیک ان ممالک کی حقیقی ترقی کا انحصار بیرونی مالی امداد پر نہیں، بلکہ ایسے بنیادی سماجی

و معاشی اداروں کے قیام پر تھا جو پائیدار خوشحالی کی بنیاد فراہم کر سکیں، مثلاً نجی ملکیت (private property) کا تحفظ، معاشی آزادی، سرمایہ دارانہ نظام (capitalism) اور کاروباری واختراعی جذبے (entrepreneurial spirit) کا فروغ۔ ان کا استدلال تھا کہ ان ریاستوں کو ٹیکس دہندگان کے وسائل سے فراہم کی جانے والی حکومت بہ حکومت (government-to-government) امداد پر انحصار کرنے کے بجائے، خود ان ادارہ جاتی بنیادوں کو مضبوط بنانے پر توجہ دینی چاہیے۔

ان چند مشاہدات اور حوالوں سے واضح ہوتا ہے کہ لڈوگ وون مزِس (Ludwig von Mises) نے کلاسیکی لبرل اصولوں کے بین الاقوامی اطلاق پر سنجیدگی اور گہرائی سے غور کیا تھا۔ قوم، قومیت اور حقِ علیحدگی (secession) کے بارے میں ان کے افکار وقت کے ساتھ ارتقا پذیر رہے اور ان کے نظریات میں نسبتاً زیادہ حقیقت پسندی اور سختی پیدا ہوتی گئی۔ دو دہائیوں سے زائد عرصے تک وہ اس تصور کے حامی رہے کہ غیر مستحکم خطوں میں امن اور استحکام کے قیام کے لیے بین الاقوامی یا فوق قومی (supranational) تعاون اور وفاقی ڈھانچے مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ ان کی بنیاد مضبوط معاشی اصولوں اور دیگر کلاسیکی لبرل اقدار پر استوار ہو۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد انہوں نے اس موضوع پر مزید کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کیا، بلکہ اپنی توجہ عالمی سطح پر ریاستی مداخلت پر مبنی پالیسیوں پر تنقید کی طرف مبذول کر دی، جن میں بالخصوص ترقیاتی امداد (development aid) کو وہ ایک غیر مؤثر اور گمراہ کن پالیسی تصور کرتے تھے۔

ایف۔اے۔ہائیک (1899–1992)

ایف۔اے۔ہائیک بلاشبہ بیسویں صدی کے اہم ترین کلاسیکی لبرل (classical liberal) مفکرین میں شمار ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ نوبیل انعام یافتہ ماہرِ معاشیات تھے، تاہم ان کی علمی کاوشوں کا

دائرۂ کار نہایت وسیع تھا، جس میں سیاسی و قانونی فلسفہ، سیاست اور بین الاقوامی تعلقات جیسے موضوعات بھی شامل تھے۔ ان کے نزدیک معاشی نظریہ دانوں اور سیاسی فلسفیوں کی ذمہ داری محض موجودہ حالات کی تشریح تک محدود نہیں تھی، بلکہ انہیں ان حالات پر اثر انداز ہونے اور انہیں بہتر سمت میں ڈھالنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔

بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں ہائیک کے خیالات صرف ان کی کتابوں اور علمی مضامین تک محدود نہیں تھے، بلکہ اخبارات میں شائع ہونے والے ان کے تجزیاتی کالموں میں بھی ان کی جھلک نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہے (مزید ملاحظہ ہو: Boettke, 2019; Butler, 1985; Caldwell and Klausinger, 2022)۔

مزِس (Mises) کی طرح، ہائیک (Hayek) نے بھی پہلی جنگِ عظیم کے دوران آسٹریا کی ایک ایسی فوجی رجمنٹ میں خدمات انجام دیں جہاں گیارہ زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اس تجربے نے انہیں یہ احساس دلایا کہ قوم پرستی آسٹریا۔ہنگری کی سلطنت کے زوال کی اہم وجوہات میں سے ایک تھی۔ اسی تجربے نے ہائیک پر یہ حقیقت بھی واضح کی کہ فرد کی زندگی میں 'گروہ' کی اہمیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ بین الاقوامی سیاست کے تناظر میں سب سے اہم گروہ 'قوم' تھی، جسے وہ ایک 'ہم جنس خصوصیات کی حامل برادری (homogeneous community)' کے طور پر دیکھتے تھے۔

قوم فرد کی شناخت کا ایک اہم جزو تھی اور اقوام انسانی تنظیم اور افراد کی وفاداری کا بنیادی مرکز تھیں۔ ہائیک نے اقوام کو مشترکہ ثقافت سے وابستہ کیا، جس کا اظہار زبان سمیت زبانی اور غیر زبانی طرزِ اظہار، لباس، خوراک اور دیگر مشترکہ خصوصیات میں ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک شناخت انسانی رویے کو متحرک کرنے والی ایک نہایت طاقتور قوت تھی۔ ہائیک کا خیال تھا کہ لوگ مختلف قومیت رکھنے والے گروہوں کی طویل مدتی بالادستی کو قبول نہیں کریں گے۔

ہائیک کو حب الوطنی سے کوئی اصولی اختلاف نہیں تھا، تاہم وہ 'قوم پرستی کے زہر' (poison of nationalism) کے خطرات سے خبردار کرتے تھے (Van de Haar 2022)۔
یہاں زیرِ بحث چاروں کلاسیکی لبرل مفکرین میں ہائیک (Hayek) سب سے زیادہ سخت گیر (hawkish) نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ وہ جنگ کو پالیسی کے ایک معمول کے آلے کے طور پر نہیں دیکھتے تھے، بلکہ اسے انسانی فطرت سے پھوٹنے والی زندگی کی ایک ناگزیر حقیقت سمجھتے تھے۔ ان کا بنیادی استدلال یہ تھا کہ تحفظ کے بغیر آزادی کا وجود ممکن نہیں؛ چنانچہ ایک مستحکم بین الاقوامی نظامِ امن وامان کی اہمیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔
وہ جنگ کے دوران بنیادی انسانی آزادیوں کی عارضی معطلی یا قربانی کی حد تک جانے کے لیے بھی آمادہ تھے۔ تاہم، مزِس (Mises) کی طرح، وہ جنگی حالات میں معاشی نظام کو مرکزی کنٹرول میں لانے (economic centralisation) کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک حالتِ جنگ میں بھی معیشت میں ریاستی مداخلت کا جواز پیدا نہیں ہوتا۔
اپنی زندگی کے آخری دور میں ہائیک کا موقف مزید سخت گیر ہوتا گیا۔ متعدد مشترکہ اداریوں میں انہوں نے امریکی صدر ریگن کے دفاعی اخراجات میں اضافے کے منصوبے کی حمایت کی اور استدلال کیا کہ عالمی امن کا انحصار امریکہ کے مضبوط رہنے پر ہے۔ انہوں نے جوہری بازداریت (nuclear deterrence) کی پالیسی کی حمایت کی، مغربی ممالک کی جانب سے 1980 کے ماسکو اولمپکس کے بائیکاٹ کی تائید کی، اور ایران میں یرغمالیوں کے بحران کے دوران امریکی مداخلت کا مطالبہ کیا۔

ہائیک امن پسندی (pacifism) کو جنگ کی بڑی وجوہات میں سے ایک سمجھتے تھے۔ فاکلینڈز کی جنگ کے دوران انہوں نے برطانیہ کی حمایت کی اور استدلال کیا کہ ارجنٹائن کی حکومت نے بین الاقوامی قانون کے متعدد دیرینہ اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے۔ ان تحریروں میں انہوں نے اپنے بنیادی مؤقف کو ایک بار پھر واضح کیا کہ انفرادی آزادی کا انحصار ایک ایسے بین الاقوامی نظام کے

برقرار رہنے پر ہے جس میں ضرورت پڑنے پر ریاستی طاقت، حتیٰ کہ طاقت یا تشدد کا استعمال بھی، ایک مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ اسی بنا پر آزادی پر عائد ہونے والی ممکنہ پابندیوں کے بارے میں وہ بہت سے دوسرے لبرل مفکرین کی نسبت نسبتاً کم تشویش رکھتے تھے۔

وفاق (federation) کے قیام کو ترجیح دینا ہائیک (Hayek) کی بین الاقوامی فکر کا ایک مستقل پہلو تھا (Van de Haar 2022)۔ 1930 کی دہائی میں انہوں نے یورپی یا مغربی وفاق کی ممکنہ صورتوں سے متعلق جاری مباحث میں حصہ لیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے LSE کے ساتھی لیونل رابنز (Lionel Robbins)، مغربی وفاق کے لیے کلیرنس اسٹریٹ (Clarence Streit) کے 'اسٹریٹ پلان (Streit Plan)'، اور حتیٰ کہ فرانس اور برطانیہ کو وفاقی بنیادوں پر متحد کرنے کے نارمن اینجل (Norman Angell) کے تصور کی بھی حمایت کی۔ ہائیک نے دونوں ممالک کے درمیان مکمل مالیاتی اور معاشی اتحاد کی تجویز بھی پیش کی، کیونکہ ان کے خیال میں آنے والی جنگ—جس کے 1930 کی دہائی میں بہت سے لوگوں کو ناگزیر ہونے کا اندیشہ تھا—کا مقابلہ کرنے اور اسے جیتنے کا یہی بہترین طریقہ تھا۔ فوجی وسائل کا بین الاقوامی سطح پر اشتراک بعض حالات میں مفید ہو سکتا تھا۔ ان کے نزدیک اس سے ریاستی امور میں (decentralization) کو بھی فروغ دیا جا سکتا تھا، کیونکہ وہ قومی دفاع کو ملکی سیاست میں مرکزیت پیدا کرنے والی ایک اہم قوت سمجھتے تھے۔

بعد ازاں، ہائیک نے اسرائیل اور مشرقِ وسطیٰ کے متعدد رہنماؤں کے سامنے یروشلم اور/یا اردن کے بعض حصوں، مشرقی کنارے (East Bank) اور اسرائیل کو ایک وفاقی نظام کے تحت متحد کرنے کے منصوبے بھی پیش کیے۔ ان کا خیال تھا کہ یروشلم کو واشنگٹن ڈی سی کی طرز پر ایک ایسا شہر ہونا چاہیے جہاں وفاق میں شامل تمام رکن ریاستوں کے شہریوں کو آزادانہ رسائی حاصل ہو۔ تاہم، جن اسرائیلی سیاست دانوں کے سامنے انہوں نے یہ تجاویز پیش کیں، انہوں نے اس تصور میں بہت کم دلچسپی کا اظہار کیا۔

اس سلسلے میں 'ہائیکین' (Hayekian) استدلال یہ تھا کہ وفاقیت کو آخری حربے کے طور پر اختیار کیا جانا چاہیے، بالخصوص ایسے سیاسی تنازعات کے حل کے لیے جو دیگر ذرائع سے حل نہ ہو سکے ہوں۔ وہ وفاقی نظام کو پُرامن تعاون کے لیے سازگار سمجھتے تھے، کیونکہ اس میں دفاع اور خارجہ پالیسی جیسے روایتی طور پر خود مختاری سے متعلق معاملات میں مرکزی وفاقی اختیار کے ساتھ ساتھ ایک 'معاشی اتحاد' بھی شامل ہوتا ہے۔ وفاقی حکومت کا بنیادی فریضہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایسے اقدامات کو روکے جن سے اس کے قیام میں شریک اکائیوں کو ممکنہ نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو۔ اس طرح، کسی 'تعمیری نظریے' (constructivist preference) کے تحت نہیں، بلکہ ایک مستحکم بین الاقوامی نظام کے قیام کی خواہش سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے، نسبتاً منظم اور پُرامن سیاسی صورتِ حال پیدا کی جا سکتی تھی۔

اگرچہ ہائیک (Hayek) ہمیشہ الفاظ کے انتخاب میں پوری احتیاط نہیں برتتے تھے، جس کے باعث بعض اوقات ان کے اصل موقف اور ارادے کے بارے میں ابہام پیدا ہو جاتا تھا، تاہم ان کے خیالات کا بغور جائزہ لینے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ایسی بین الاقوامی تنظیموں یا بین الاقوامی قوانین کے حامی نہیں تھے جن کا مقصد کسی 'تعمیری (constructivist)' ہدف کا حصول ہو۔ 1940 کی دہائی میں انہوں نے اقوامِ متحدہ (UN) کو اس بنیاد پر مسترد کر دیا کہ اسے بھی وہی بنیادی مسائل درپیش تھے جو لیگ آف نیشنز (League of Nations) کو لاحق تھے: یہ ایک حد سے زیادہ وسیع تنظیم تھی، اس کے پاس مؤثر اختیارات کا فقدان تھا، اور اس میں ایسے ممالک کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو جغرافیائی اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت دور واقع تھے۔

ہائیک کا خیال تھا کہ کسی بین الاقوامی تنظیم سے یہ توقع رکھنا کہ وہ دنیا میں جنگ کو ناممکن بنا دے گی، محض حماقت ہے، کیونکہ بین الاقوامی تنظیمیں خود بھی بین الاقوامی کشیدگی کا سبب بن سکتی ہیں۔ 1970 کی دہائی میں انہوں نے اقوامِ متحدہ کو غیر مؤثر اور 'تعمیری (constructivist)'

سوچ سے متاثر قرار دیتے ہوئے اس پر مزید تنقید کی۔ حسبِ توقع، انہوں نے بین الاقوامی محنت تنظیم (International Labour Organization, ILO) کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کے نزدیک اقوامِ متحدہ مغربی لبرل جمہوری روایت اور مارکسزم کو یکجا کرنے کی ایک ناکام کوشش تھی۔

تاہم، ہائیک تمام بین الاقوامی تنظیموں کے مخالف نہیں تھے۔ وہ ایسی تنظیموں کو ترجیح دیتے تھے جن کا دائرۂ کار محدود اور اختیارات متعین ہوں، بالکل اسی اصول کی طرح جس کے تحت ملکی سطح پر 'محدود ریاست (limited state) 'کا تصور پیش کیا جاتا ہے۔

اگرچہ وہ 'عالمی منشورِ حقوقِ انسانی (Universal Declaration of Human Rights) ' کو اہم سمجھتے تھے اور اس میں شامل روایتی انسانی حقوق کی قدر کرتے تھے، تاہم انہیں اس بات پر افسوس تھا کہ اس میں متعدد ایسے سماجی اور معاشی حقوق بھی شامل کر دیے گئے تھے جو ان کے نزدیک مبہم، مضحکہ خیز اور ناقابلِ نفاذ تھے۔ بہت سے روایتی لبرلز کی طرح، ہائیک بھی انسانی حقوق کو 'مثبت حقوق' یعنی کسی چیز کے حصول یا فراہمی کے حق کے طور پر نہیں دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک بین الاقوامی قانون قومی حکومتوں کے نقصان پہنچانے کے اختیارات کو اسی صورت میں محدود کر سکتا ہے جب 'اعلیٰ ترین مشترکہ اقدار منفی نوعیت کی ہوں'؛ یعنی اعلیٰ ترین مشترکہ اصول ہی نہیں بلکہ اعلیٰ ترین مشترکہ اختیار بھی بنیادی طور پر ممانعتوں تک محدود ہونا چاہیے۔ انہیں اس بات پر بھی افسوس تھا کہ خود مختاری اور ریاست کے تصورات قانونی وضعیت پسندوں (legal positivists) کے ہاتھوں ایسے اوزار بن گئے تھے جنہیں وہ اپنے نظریاتی مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔

1980 کی دہائی میں جب ہائیک (Hayek) نے جنرل پنوشے کے دورِ حکومت میں چلی اور نسلی امتیاز (apartheid) کے نظام سے دوچار جنوبی افریقہ کا دورہ کیا تو انہیں شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ انہوں نے کبھی ان حکومتوں کی سیاسی پالیسیوں کی حمایت نہیں کی، تاہم ان کا دفاع اس

استدلال کے ذریعے کیا کہ چین، لیبیا، الجزائر یا یوگنڈا جیسی سوشلسٹ آمریتوں کے مقابلے میں ان حکومتوں کو اتنا برا نہیں سمجھا جانا چاہیے خصوصاً اس لیے کہ ان کے خیال میں مؤخرالذکر حکومتوں کو اسی نوعیت کی تنقید کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اگرچہ یہ استدلال کسی حد تک درست ہو سکتا ہے، لیکن اسے ان حکومتوں کے لیے ایک مضبوط دفاع قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ہائیک چلی کے آمر جنرل پنوشے کی معاشی پالیسیوں کے حوالے سے خاصے پُرجوش تھے۔ تاہم، جیسا کہ مارگریٹ تھیچر نے انہیں لکھے گئے ایک خط میں نشاندہی کی، چلی نے 'بلاشبہ کچھ معاشی کامیابیاں حاصل کی تھیں، لیکن اس کی بعض دیگر پالیسیاں مکمل طور پر ناقابلِ قبول تھیں' ملاحظہ ہو (Van de Haar 2009)۔

ہائیک نے اصولی، سیاسی اور معاشی بنیادوں پر نوآبادیاتی نظام کے خاتمے (decolonization) کی حمایت کی۔ میزس (Mises) کی طرح، انہوں نے بھی حکومتوں کے مابین دی جانے والی ترقیاتی امداد کو سختی سے مسترد کیا اور اس معاملے میں پیٹر باؤر (Peter Bauer) کے ابتدائی کام سے متاثر تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ ناقص معاشی پالیسیاں غریب ممالک کو غربت میں مبتلا رکھتی ہیں، جبکہ ان کے لیے خوشحالی کی جانب بڑھنے کا بہترین راستہ بہتر معاشی اور سماجی پالیسیاں اختیار کرنا ہے۔ ان کے نزدیک، بیرونی امداد نہ تو پائیدار ترقی کو فروغ دیتی ہے اور نہ ہی غربت کا خاتمہ کرتی ہے؛ اس کے برعکس، یہ امداد دینے والے ممالک کو امداد حاصل کرنے والے ممالک کے داخلی معاملات میں ضرورت سے زیادہ مداخلت کا موقع فراہم کرتی ہے۔

ہائیک آزاد منڈی پر مبنی سرمایہ داری کو معاشی ترقی کا بنیادی ضامن سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک، حقوقِ ملکیت کا تحفظ اور معاشی آزادی کاروباری اور تخلیقی جذبے (entrepreneurial spirit) کو فروغ دیتے ہیں، جو بالآخر جدت اور معاشی ترقی کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ وہ دولت کی بین الاقوامی سطح پر از سرِ نو تقسیم (redistribution) کے کسی حق کے قائل نہیں تھے؛ ان

کے نزدیک یہ عمل نہ صرف اخلاقی طور پر ناقابل جواز تھا بلکہ اپنے مطلوبہ نتائج کے حصول میں بھی ناکام رہتا تھا۔

ہائیک نے آبادی میں اضافے کو محدود کرنے کی پالیسیوں کی بھی مخالفت کی اور استدلال کیا کہ سرمایہ داری دراصل زندگی اور انسانی خوشحالی کے فروغ کا ذریعہ ہے۔ اس معاملے میں وہ 'کارنوکوپین' (cornucopian) ماہرِ معاشیاتِ ماحولیات جولین سائمن (Julian Simon) سے متاثر تھے۔ سائمن کا مؤقف تھا کہ اگر آبادی میں اضافے کے نتیجے میں وسائل کی قلت پیدا ہوتی ہے تو یہ صورتِ حال خود مسئلے کے حل کے لیے متبادل ذرائع اور بہتر ٹیکنالوجی تلاش کرنے کی ترغیب پیدا کرتی ہے۔ ان کے نزدیک انسانی عزم، ذہانت اور پختہ ارادہ ہی 'حتمی وسائل' (ultimate resources) کی حیثیت رکھتے ہیں (Simon 1996)۔

آزاد تجارت کے پرزور حامی کی حیثیت سے، ہائیک کا ماننا تھا کہ دنیا بھر کے لوگوں کی زیادہ سے زیادہ مادی خوش حالی کے حصول کے لیے بین الاقوامی تجارت پر عائد معاشی رکاوٹوں کو ختم کیا جانا چاہیے۔ انہوں نے 'جنرل ایگریمنٹ آن ٹیرفس اینڈ ٹریڈ (GATT)' کے تحت ہونے والے مذاکراتی ادوار کی پیش رفت کی حمایت کی، جن کے نتیجے میں تجارتی محصولات (tariffs) میں کمی واقع ہوئی۔ ان کے نزدیک معاشی قوم پرستی بالآخر جنگ کا باعث بن سکتی تھی۔ انہوں نے مالیاتی قوم پرستی کے خطرات سے بھی خبردار کیا اور کرنسی کو قومی حکومتوں کے کنڑول سے آزاد کرنے، یعنی 'زرقوم کی غیر قومی تحویل (denationalization of money)'، کے حق میں دلائل پیش کیے (Hayek 1990)۔

اگرچہ ہائیک نظریاتی طور پر آزادانہ امیگریشن (آزادانہ نقلِ مکانی) کے حامی تھے، تاہم انہوں نے خبردار کیا کہ عملی طور پر یہ طریقہ مؤثر ثابت نہیں ہوگا۔ انہیں خدشہ تھا کہ مختصر مدت میں تارکینِ وطن کی بڑی تعداد کی آمد کسی نسبتاً یکساں سماجی ساخت کے حامل معاشرے میں عدم استحکام پیدا کر

سکتی ہے۔ان کے نزدیک اس کے نتیجے میں قوم پرستانہ ردِ عمل اور بالآخر غیر ملکیوں کے خلاف نفرت (زینوفوبیا) جنم لے سکتی ہے، جو اس سے بھی زیادہ سنگین صورتِ حال ہو گی۔

ان کے خیال میں اس مسئلے سے نمٹنے کا بہترین طریقہ امیگریشن کی ایک تدریجی پالیسی اختیار کرنا تھا، جیسا کہ انہوں نے 'دی ٹائمز' میں شائع ہونے والے اپنے مضامین کے ایک سلسلے میں بھی بیان کیا (Hayek 2022)۔

مختصراً چار عظیم کلاسیکی لبرل مفکرین کے بین الاقوامی امور سے متعلق افکار کا یہ خلاصہ ناگزیر طور پر ایک اجمالی جائزے تک محدود ہے۔اس میں ان کے بعض بنیادی تصورات مثلاً انسانی فطرت کے بارے میں ان کے نظریات، جنگ کے خاتمے کے امکان، بین الاقوامی نظام کے تحفظ کے ذرائع، اور آزاد تجارت کے سیاسی اثرات کا احاطہ کیا گیا ہے۔اگلے حصے میں ان خیالات کا مزید تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا، جس کے دوران ہیوم(Hume) ، سمتھ(Smith) ، میزس (Mises) اور ہائیک (Hayek) کی تحریروں سے بھی حسبِ ضرورت رجوع کیا جائے گا۔

یہ بحث بالآخر بین الاقوامی تعلقات کے ایک باقاعدہ کلاسیکی لبرل نظریے کی تشکیل کرنے والے بنیادی اجزا کی شناخت اور تجزیے کی طرف لے جائے گی؛انہی بنیادی اجزا کو فریڈن(Freeden) 'تصورات'(concepts)سے تعبیر کرتے ہیں۔

حصہ دوم: بنیادی اجزا

پانچواں باب

افراد: انسانی فطرت، فطری اور انسانی حقوق

بین الاقوامی تعلقات اور خارجہ پالیسی دراصل انسانی تعلقات ہی کی ایک صورت ہیں (Jackson 2000)۔ بین الاقوامی تعلقات کے ماہرین عالمی سیاسی اور معاشی نظام کا مطالعہ کرتے ہیں؛اس میں دیگر امور کے ساتھ ساتھ ریاستوں کا وہ کردار بھی شامل ہے جو مختلف ادارہ جاتی نظاموں جیسے بین الاقوامی ضابطہ ہائے کار(regimes)، بین الاقوامی قانون اور طاقت کے توازن سے متاثر ہوتا ہے۔ بلاشبہ، ان میں سے بعض تصورات کا اس کتاب میں بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ تاہم، یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ بین الاقوامی تعلقات بنیادی طور پر انسانوں سے متعلق ہیں۔ درحقیقت، انسانی عمل ہی عالمی نظام کو حرکت میں رکھتا ہے۔

لبرل ازم، یعنی آزادی کا نظریہ، داخلی اور بین الاقوامی، دونوں سطحوں پر انفرادیت پسندی کا سیاسی اظہار ہے۔ جیسا کہ تعارف میں اشارہ کیا گیا ہے، اس سے یہ بنیادی سوالات پیدا ہوتے ہیں: انسانی فطرت اور انفرادی حقوق کے بارے میں کلاسیکی لبرل نقطۂ نظر کیا ہے، اور اس نقطۂ نظر کے بین الاقوامی تعلقات کے لیے کیا مضمرات ہیں؟

اس باب میں ان سوالات کا جواب تین باہم مربوط موضوعات پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے دیا جائے گا: اول، انسانی فطرت؛ دوم، انسانی فطرت کے بارے میں کلاسیکی لبرل نقطۂ نظر کے بین الاقوامی تعلقات پر اثرات اور مضمرات؛ اور سوم، فطری اور انسانی حقوق۔

انفرادیت پسندی پر مبنی سیاسی نظریے کے طور پر، ہر لبرل نظریے کا نقطۂ آغاز فرد ہوتا ہے، اور یہی بات بین الاقوامی نظریے پر بھی صادق آتی ہے۔ یہاں ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ فرد کو کس نظر سے دیکھا جاتا ہے اور انسانی فطرت کو کس نوعیت کا سمجھا جاتا ہے۔ انسان کی صلاحیتیں اور حدود کیا ہیں؟ اس سوال کے دو بنیادی پہلو ہیں: جسمانی اور ذہنی۔ جسمانی پہلو ایک مسلمہ حقیقت ہے اور، تمام تر اختلافات کے باوجود، عموماً اس بات پر اثر انداز نہیں ہوتا کہ بین الاقوامی نظریہ کس طرح تشکیل پاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ذہنی پہلو زیادہ اہم اور زیادہ متعلقہ ہے۔

'انسانی فطرت کا علم'

زیادہ تر سیاسی نظریات کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ انسان کو کس نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ انسان کی صلاحیتیں کیا ہیں؟ کیا وہ مشکلات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ کیا وہ چست، مضبوط یا کمزور ہے؟ کیا وہ فطرتاً سماجی ہے یا سماج دشمن؟ انسانی جذبات اور عقل کا اس کے رویّے میں کیا کردار ہے؟ سیاسی بحث و مباحثہ اکثر انسانی فطرت کے بارے میں بنیادی تصورات کے درمیان کشمکش کی صورت اختیار کر لیتا ہے، کیونکہ مختلف سیاسی نظریات اور افکار کی بنیاد انسانی فطرت کے بارے میں مختلف تصورات پر استوار ہوتی ہے۔

انسانی فطرت روشن خیالی (Enlightenment) کے عہد میں ایک بنیادی موضوع تھی، اور یہی وہ دور تھا جسے عام طور پر کلاسیکی لبرل فکر کی ابتدا کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے۔ روشن خیالی کے بہت سے مفکرین نے اس بنیادی سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی کہ انسانی فطرت کیا ہے؟ اسی

کوشش کے نتیجے میں، ہیوم (Hume) کے الفاظ میں، 'انسان کا علم (science of man) ' وجود میں آیا۔ یہ علم سماجی دنیا کو سمجھنے کی بنیاد فراہم کرتا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اسے اس طریقۂ کار سے مماثل بنایا جائے جس کے ذریعے نیوٹن (Newton) جیسے طبیعی علوم کے ماہرین نے قدرتی دنیا کے حقائق دریافت کیے تھے۔

اس فکر میں ایک اہم تصور یہ تھا کہ انسانوں کے درمیان بے شمار اختلافات کے باوجود، دنیا کے مختلف معاشروں اور انسانی تاریخ کے آغاز سے لے کر آج تک، انسانی اعمال میں ایک نمایاں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ انسانی فطرت کو نسبتاً مستقل اور مستحکم سمجھا گیا؛ چنانچہ انسانی فطرت کا علم انسانوں کے رویّوں اور اعمال کی توضیح کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

ڈیوڈ ہیوم (David Hume) اور ایڈم سمتھ (Adam Smith) نے اس علمی کاوش میں اہم کردار ادا کیا۔ ہیوم نے A Treatise of Human Nature (1739–40) تحریر کی، جبکہ بعد ازاں An Enquiry Concerning Human Understanding (1748) اور An Enquiry Concerning the Principles of Morals (1751) میں اپنے خیالات کو مزید واضح کیا۔ اپنے ہم عصروں میں ایڈم سمتھ کو The Theory of Moral Sentiments (1759) کی وجہ سے خاص شہرت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں — مثلاً ہمدردی، جذبات، خوبیوں، اچھائی اور برائی کے احساس، نیز انصاف اور فرض کا ایک جامع بیان پیش کرتی ہے۔

انسانی فطرت کا سوال کلاسیکی لبرل فکر میں ہمیشہ مرکزی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ مثال کے طور پر، لڈوگ وون میزس (Ludwig von Mises) نے اپنی کتاب Human Action (1949) میں، جبکہ ایف۔ اے۔ ہائیک (F. A. Hayek) نے The Constitution of Liberty (1960) میں اپنے معاشی اور سیاسی نظریات کی تشکیل انسانی عقل کی بنیادی صلاحیتوں اور اس کی حدود کے تجزیے سے شروع کی۔

کلاسیکی لبرل نقطۂ نظر

انسانی فطرت کے بارے میں کلاسیکی لبرل نقطۂ نظر کیا ہے؟ کلاسیکی لبرلز انسانی فطرت کے بارے میں ایک حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ وہ انسان کو ایک سماجی وجود سمجھتے ہیں، جو گروہوں کی صورت میں زندگی گزارتا ہے اور اپنی بقا کے لیے بڑی حد تک دوسروں پر انحصار کرتا ہے۔ یہ نکتہ اس لیے اہم ہے کہ ناقدین اکثر کلاسیکی لبرل ازم کو انفرادیت پسندی کے حوالے سے 'بنیاد پرستانہ' (fundamentalist) قرار دیتے ہیں۔

تاہم، کلاسیکی لبرلز انسان کو نہ تو خود غرض اور نہ ہی محض ایک 'منفرد و خود کفیل وجود' (atomistic individual) سمجھتے ہیں، جو صرف اپنے مفادات سے سروکار رکھتا ہو اور دوسروں کی کوئی پروانہ کرتا ہو۔ اس نوعیت کی تنقید یا تو کلاسیکی لبرل ازم کی دانستہ طور پر گمراہ کن تعبیر پر مبنی ہوتی ہے، یا پھر اس کے اہم اور بنیادی علمی متون سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

کلاسیکی لبرلز انسانی فطرت کو مثالی نہیں سمجھتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسانوں کی کسی 'مثالی یا بہتر صورت' کی تشکیل کے لیے کوشاں نہیں رہتے اور نہ ہی اپنے نظریات کی بنیاد ایسے کسی تصور پر رکھتے ہیں۔ وہ انسان کو اسی طرح تسلیم کرتے ہیں جیسے وہ حقیقت میں ہے، اور انسانی رویّے کی توضیح جذبات اور عقل کے باہمی تعامل کے ذریعے کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انسانی جسم کی ان واضح حدود کو بھی پیشِ نظر رکھا جاتا ہے جو، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، طاقتور ترین انسان کو بھی محدود کرتی ہیں۔

کلاسیکی لبرلز کے نزدیک انسانی عقل کی بھی اپنی حدود ہیں؛ مثلاً انسان بہت زیادہ معلومات کو بیک وقت جانچنے اور سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، وہ غلطیوں سے مکمل طور پر محفوظ نہیں رہ سکتا، اور نہ ہی ہر وقت اپنے جذبات پر قابو رکھ پاتا ہے۔ دیگر حیوانات کے مقابلے میں انسان کو زیادہ ذہین اور

تخلیقی ضرور سمجھا جاتا ہے، لیکن وہ خطا سے پاک نہیں۔ وہ ہر وقت اپنی 'افادیت (utility)' کو زیادہ سے زیادہ کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا۔ مزید برآں، مختلف افراد اپنی فلاح اور افادیت کے بارے میں مختلف تصورات رکھتے ہیں۔

انسانی فرد ایک لچک دار وجود ہے جو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ زندگی گزارنے، اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور خوشی حاصل کرنے کا کوئی ایک متعین راستہ نہیں ہو سکتا، جیسا کہ جان اسٹورٹ مل (John Stuart Mill) نے بھی استدلال کیا۔ درحقیقت، 'زندگی کے پہلے سے طے شدہ راستے' جیسی کوئی چیز سرے سے موجود ہی نہیں۔

انسانی ذہن کی صلاحیتیں حیرت انگیز ہیں، لیکن ان کی اپنی حدود بھی ہیں۔ کلاسیکی لبرلز کے نزدیک، دنیا کے انتہائی ذہین افراد بھی معیشت جیسے پیچیدہ نظام کی مکمل منصوبہ بندی کرنے سے قاصر ہیں، چہ جائیکہ وہ پورے معاشرے کی منصوبہ بندی کر سکیں(Hayek 1993) ۔ یہ کام عملاً ممکن ہی نہیں۔ اسی بنا پر کلاسیکی لبرلز نے ان تصورات پر استوار سیاسی نظریات کی مخالفت کی ہے۔ کمیونزم اور سوشلزم اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اس کے برعکس، 'سوشل لبرلز (social liberals)' انسانی عقل کی صلاحیت اور عقلی بنیادوں پر معاشرے کو ازسرِنو تشکیل دینے کی انسانی اہلیت کے بارے میں کہیں زیادہ پُرامید ہیں۔

انسانی رویّے کی توضیح میں جذبات بھی ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہیوم (Hume) نے تو یہاں تک کہا کہ 'عقل جذبات کی غلام ہے، اور اسے ایسا ہی ہونا چاہیے۔' ان کے نزدیک اخلاقیات، یعنی صحیح اور غلط کے سوالات، کسی عقلی منصوبے یا محض استدلال پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ ذوق اور جذبات سے گہرا تعلق رکھتے ہیں(Hume 2000)۔

کلاسیکی لبرلز کا ماننا ہے کہ انسان ہمیشہ درست طرزِ عمل اختیار کرنے پر قادر نہیں ہوتے۔ تنازعات، کشمکش، تشدد اور غیر اخلاقی رویّہ انسانی فطرت کے بنیادی پہلو ہیں۔ تاہم، اس کا مطلب یہ نہیں کہ

انسان ہر وقت بحث و تکرار، لڑائی جھگڑے یا بد سلوکی میں مبتلا رہتے ہیں۔ بیشتر لوگ سماجی نظم و ضبط کو اہمیت دیتے ہیں تاکہ ایک ایسا نتیجہ خیز اور با مقصد معاشرہ قائم رہ سکے جس میں وہ اپنی صلاحیتوں کو اپنی مرضی کے مطابق بروئے کار لا سکیں۔

تاہم، یہ سمجھنا خام خیالی ہے کہ تمام انسان ہمیشہ کسی اعلیٰ اور طویل المدتی مقصد مثلاً عالمی امن کے حصول کے لیے اپنے جذبات پر قابو پا لیں گے، یا یہ کہ سب لوگ ان اصولوں کی پابندی کرنے پر آمادہ اور قادر ہوں گے جو معاشرے کو متحد رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ داخلی سطح پر قانون کے نفاذ اور عدلیہ جیسے اداروں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس بنیادی نکتے کے بین الاقوامی تعلقات میں انسانی رویّے اور ریاستوں کے طرزِ عمل پر بھی اہم اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

بین الاقوامی تعلقات پر اثرات

انسانوں کے لیے تنازعات اور تشدد کا مکمل خاتمہ ناممکن ہے۔ یہ ایک افسوس ناک، مگر سادہ حقیقت ہے۔ مؤرخ مارگریٹ میک ملن (Margaret MacMillan) نے واضح کیا ہے کہ جنگ انسانی تاریخ کی ایک بنیادی خصوصیت رہی ہے(MacMillan 2020) ۔ جنگ کوئی غیر معمولی یا انحرافی کیفیت نہیں، اور نہ ہی امن معاملات کی کوئی 'معمول کی حالت' ہے۔ انسانی معاشرہ اور جنگ ایک دوسرے سے گہرے طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ اگر ہم دنیا کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں جنگ کو بھی سمجھنا ہوگا۔

کلاسیکی لبرلز اسے انسانی فطرت کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کی تائید کے طور پر دیکھتے ہیں اور مستقبل میں تشدد کے مکمل خاتمے کی کوئی توقع نہیں رکھتے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کلاسیکی لبرلز تشدد کے حامی ہیں؛ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کے بارے میں نسبتاً زیادہ حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک بین الاقوامی تعلقات (IR) کے حوالے سے اہم سوال

یہ ہے کہ انسانی زندگی کی اس بنیادی حقیقت سے کس طرح نمٹا جائے، ایک ایسی حقیقت جس کی تائید انسانی فطرت کے بارے میں ہونے والی بعض جدید تحقیقات سے بھی ہوتی ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کا کلاسیکی لبرل نظریہ اسی چیز پر توجہ مرکوز کرتا ہے جسے کینتھ والٹز (Kenneth Waltz) نے 'پہلا منظر نامہ' (first image) قرار دیا تھا؛ یعنی ایسا نقطۂ نظر جو 'جنگ کی اہم وجہ انسانوں کی فطرت اور رویّوں میں تلاش کرتا ہے' (Waltz 1959)۔

جیسا کہ چرچل نے کہا تھا، بنی نوع انسان کی تاریخ بڑی حد تک جنگ کی تاریخ ہے۔ اسٹیفن پنکر (Steven Pinker) کے مطابق، انسانی زندگی کا یہ پہلو خواہ وہ ریاستوں کے درمیان جنگ ہو، نسلی تنازعات، خاندانی یا گروہی دشمنیاں، یا علاقے پر قبضے کی لڑائیاں — تمام ادوار میں موجود رہا ہے (Pinker 2002)۔ وہ اس وسیع پیمانے پر تسلیم شدہ دعوے کو رد کرتے ہیں کہ 'تشدد کا انسانی فطرت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ ہمارے باہر موجود منفی عوامل سے پیدا ہونے والی ایک بیماری یا خرابی ہے۔' پنکر کے نزدیک تشدد محض سیکھا ہوا رویّہ نہیں، بلکہ انسانی ساخت کا ایک حصہ ہے۔ انسانی ذہن کو گہرائی سے سمجھے بغیر تشدد کو پوری طرح نہیں سمجھا جا سکتا، اگرچہ سماجی اور سیاسی عوامل بھی اس میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اپنی ایک بعد کی کتاب میں، اسٹیفن پنکر نے تسلیم کیا کہ اگر انسانی تاریخ کا طویل المدتی جائزہ لیا جائے تو مجموعی طور پر انسانی تشدد جس میں گھریلو تشدد، نجی اور عوامی سطح پر ہونے والا تشدد، اور بین الاقوامی تشدد سب شامل ہیں، میں کمی کا رجحان دیکھا گیا ہے (Pinker 2011)۔ تشدد میں اس کمی کے پیچھے متعدد بیرونی عوامل اور ادارے کارفرما رہے ہیں، جنہوں نے لوگوں کو کم پر تشدد رویّہ اختیار کرنے کی ترغیب دی؛ ان میں ریاستوں کے وضع کردہ قوانین بھی شامل ہیں۔ تاہم، تشدد میں کمی کا مطلب اس کا مکمل خاتمہ نہیں ہے۔ مزید برآں، میک ملن (MacMillan) نشاندہی کرتی ہیں کہ پنکر کے نظریے کے حق میں پیش کیے جانے والے شواہد اب بھی بحث و تنقید کی گنجائش

رکھتے ہیں۔ اگر ان کا نظریہ درست بھی تسلیم کر لیا جائے، تب بھی صورتحال اطمینان بخش نہیں، کیونکہ جنگ کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں کی تعداد آج بھی انتہائی تشویش ناک ہے۔

میک ملن سویڈن کی اپسالا یونیورسٹی (Uppsala University) کے ایک طویل عرصے سے جاری تحقیقی منصوبے کا حوالہ دیتی ہیں، جس کے اندازے کے مطابق 1989 سے 2017 کے درمیان جنگوں کے نتیجے میں 20 لاکھ (2 ملین) سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے، جبکہ 1945 کے بعد سے تقریباً 5 کروڑ 20 لاکھ افراد پر تشدد تنازعات کے باعث نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔ دوسرے لفظوں میں، جنگ آج بھی ایک حقیقت ہے، اور یہ محض ترقی پذیر دنیا تک محدود نہیں۔ یوکرین میں جاری جنگ اس حقیقت کو واضح طور پر اجاگر کرتی ہے۔

اس سوال کا ایک اور زاویے سے جائزہ لیتے ہوئے، حیاتیاتی بشریات (biological anthropology) کے ماہر رچرڈ رینگھم (Richard Wrangham) اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ انسانوں نے لاکھوں سالوں پر محیط ایک ایسے عمل سے گزرا ہے جسے 'انسانی تمدنی ارتقا' کہا جا سکتا ہے — یعنی خود کو نسبتاً پرامن بقائے باہمی کے قابل بنانے کا ایک طویل تاریخی عمل۔ انسانی تشدد اور اس کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں کی شرح میں کمی ضرور آئی ہے، لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ انسان اب بھی ایک خطرناک نوع ہیں اور انہیں 'مضبوط اداروں اور ایسی مستعدی کی ضرورت ہے جو عسکریت پسندانہ نظریات کے فروغ، حد سے زیادہ پُرامید امن پسندی کے پھیلاؤ اور طاقت کے غلط استعمال کو قابو میں رکھ سکے (Wrangham 2019)'۔ انسانوں میں ردِ عملی جارحیت (reactive aggression) کا رجحان نسبتاً کم، جبکہ پیشگی یا منصوبہ بند جارحیت (proactive aggression) کا رجحان زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان امن کے طویل ادوار مستقبل کے بارے میں کسی حتمی پیش گوئی کی ضمانت نہیں دیتے۔ اگرچہ منظم تشدد کی انسانی صلاحیت میں وقت کے ساتھ کمی واقع ہوئی ہو، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تشدد مستقبل قریب میں مکمل طور پر ختم ہو جائے گا۔

اس لیے، کلاسیکی لبرلز (Classical Liberals) مستقبل قریب پر توجہ مرکوز کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بین الاقوامی امور پر خصوصی توجہ دینے والے مصنفین، مثلاً روزن (Rosen 2005)، تھائر (Thayer 2004) اور روبن(Rubin 2002) ، بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں۔ ان کا استدلال ہے کہ انسانی رویّے، اور بالخصوص سیاسی رہنماؤں کے رویّے کی پیش گوئی میں حیاتیاتی اور ادراکی (cognitive) عوامل اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ انہیں محض 'سیاسی طور پر نامناسب (politically incorrect) 'قرار دے کر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ بیسویں صدی کے آغاز سے اکثر ہوتا رہا ہے۔

جیسا کہ تھائر زور دیتے ہیں، ارتقائی نظریہ انسانی رویّے کے بارے میں اہم شواہد فراہم کرتا ہے۔ یہ مخصوص واقعات کی پیش گوئی تو نہیں کرتا، لیکن انسانی رویّے کے بارے میں ایسی بصیرت فراہم کرتا ہے جو ہمیں ان واقعات بالخصوص جنگ کے ماخذ اور اسباب کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

ایسی جدید تحقیق بھی موجود ہے جس کا تعلق ان پہلوؤں سے ہے جو پہلی نظر میں فرسودہ محسوس ہو سکتے ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات کے ماہر مائیکل ڈونی لین (Michael Donelan) نے خارجہ پالیسی میں 'عزت (honour) 'کے مسلسل کردار پر ایک دلچسپ کتاب لکھی ہے، جسے آج کل عموماً 'حیثیت(status) '، 'شہرت(fame) '، 'تحسین(admiration) '، 'شان و شوکت(glory) '، 'وقار (prestige) 'یا 'احترام (respect) 'جیسے متبادل الفاظ سے بیان کیا جاتا ہے(Donelan 2007) ۔ اسی طرح، کرسٹوفر کوکر (Christopher Coker)نے جنگ میں ثقافت اور ارتقا کی اہمیت کی نشاندہی کی ہے (Coker 2014)۔

یہ تمام شواہد کلاسیکی لبرل نظریے کی اس بنیادی بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ بین الاقوامی تعلقات میں انسانوں کو جنگ اور تشدد کے ناگزیر ظہور (outbursts) سے نمٹنا پڑتا ہے۔

فطری اور انسانی حقوق

’بین الاقوامی سطح‘ اور ’انفرادی سطح‘ کے باہم مربوط ہونے یا ایک دوسرے سے متصادم ہونے کے بھی مختلف پہلو موجود ہیں۔ کلاسیکی لبرلز انفرادی حقوق کی اہمیت کے قائل ہیں اور ان حقوق کو ’منفی نوعیت‘ کا حامل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا استدلال ہے کہ ریاست اور دیگر افراد کو کسی شخص کے حقوقِ ملکیت، آزادیِ اظہار، مذہبی آزادی، آزادیِ انجمن سازی اور دیگر بنیادی آزادیوں میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ یہاں ’منفی حقوق‘ کی اصطلاح ان حقوق کی قدر و قیمت یا اہمیت کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر کرنے کے لیے استعمال نہیں کی جا رہی، بلکہ اس سے محض یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ریاست یا دوسرے افراد کو کیا کچھ ’نہیں‘ کرنا چاہیے۔

انیسویں اور بیسویں صدیوں میں مزید ایسے حقوق شامل کیے گئے جنہیں ’مثبت حقوق‘ (positive rights) کہا جاتا ہے۔ ’منفی حقوق (negative rights)‘ کے برعکس، جو ریاست یا دوسرے افراد کو کسی خاص اقدام سے باز رکھتے ہیں، ’مثبت حقوق‘ ریاست سے عملی اقدام کا تقاضا کرتے ہیں۔ ان کی مثالوں میں روزگار، سماجی تحفظ، صحت کی دیکھ بھال اور باقاعدہ تعطیلات کا حق شامل ہیں۔

لبرل ازم (نظریۂ آزادی) کے دائرۂ کار میں، ان میں سے زیادہ تر حقوق کا تعلق ’سماجی لبرل ازم‘ (social liberalism) سے ہے۔ اکثر اوقات ان حقوق کے نفاذ کے لیے کلاسیکی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنا پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر، جب کوئی حکومت ان حقوق کی فراہمی کے لیے ٹیکس یا اجتماعی چندہ وصول کرتی ہے، تو وہ ’حقِ ملکیت‘ کی خلاف ورزی کر رہی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کلاسیکی لبرلز تمام ٹیکسوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ درحقیقت، کلاسیکی لبرلز اس بارے میں باہم اختلاف رکھتے ہیں کہ ریاست کو کیا خدمات فراہم کرنی چاہئیں اور یہ خدمات مقامی، قومی یا بین الاقوامی (supranational) سطح پر فراہم کی جانی چاہئیں۔

تاہم، وہ عموماً اس بات پر متفق ہیں کہ ریاست کو قانون کے نفاذ، عدلیہ اور قومی دفاع کے ساتھ ساتھ کچھ دیگر محدود نوعیت کے فرائض بھی انجام دینے چاہئیں؛ مثلاً بنیادی تعلیم، ماحولیاتی تحفظ، اور صحت وسماجی بہبود کے شعبوں میں ایسے خطرات سے تحفظ فراہم کرنا جن کا بیمہ (insurance) ممکن نہ ہو۔

حقوق کبھی بھی مطلق یا غیر مشروط نہیں ہوتے؛ ایک شخص کی آزادی وہاں ختم ہوتی ہے جہاں دوسرے شخص کی آزادی شروع ہوتی ہے۔ 1859 میں جان اسٹورٹ مل نے اس تصور کو 'نظریۂ ضرر' یا 'اصولِ عدمِ ضرر' (harm principle) کا نام دیا (Mill 1989)۔ اس کی ایک معروف مثال یہ ہے کہ آزادیِ اظہار آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ آپ لوگوں سے بھرے ہوئے تھیٹر میں 'آگ، آگ' کا شور مچا کر افراتفری اور ہنگامہ برپا کر دیں۔

اس بحث کا بین الاقوامی تعلقات سے کیا تعلق ہے؟ کیا انسانی حقوق کا تحفظ بڑی حد تک داخلی سیاست کا معاملہ نہیں ہے؟ یہ بات درست ہے، لیکن اس کا ایک اہم بین الاقوامی پہلو بھی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ انسانی حقوق بین الاقوامی معاہدوں میں درج ہیں، جیسے کہ 'انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ' (1948) یا کونسل آف یورپ کا زیادہ تفصیلی 'یورپی کنونشن برائے انسانی حقوق' (1950)۔ اس کے علاوہ، انسانی حقوق کے لیے بین الاقوامی عدالتیں اور ٹربیونل بھی قائم کیے گئے ہیں، مثال کے طور پر سابقہ یوگوسلاویہ کے لیے عارضی 'انٹرنیشنل کریمنل ٹربیونل' یا مستقل 'انٹرنیشنل کریمنل کورٹ' (عالمی فوجداری عدالت)۔

بین الاقوامی ایجنڈے پر انسانی حقوق کے بیرونی تحفظ (یا نفاذ) سے متعلق سوالات بھی موجود ہیں۔ کیا کسی ملک کی حکومت کی جانب سے اپنے ہی شہریوں کے ساتھ بدسلوکی بین الاقوامی برادری کے لیے تشویش کا باعث ہونی چاہیے؟ کیا ریاستوں کو ان شہریوں کی حمایت میں مداخلت کرنی چاہیے جن کے حقوق کی پامالی ہو رہی ہو؟ اور اس صورت میں فوجی مداخلت کے بارے میں کیا خیال ہے جب آمر

اپنے ہی لوگوں کو ہلاک کریں، نسل کشی کریں یا اس سے ملتے جلتے مظالم کا ارتکاب کریں؟ اقوام متحدہ اس اصول کو 'تحفظ کی ذمہ داری' (Responsibility to Protect) یا R2P کہتی ہے۔ بین الاقوامی تعلقات میں انسانی حقوق کا کردار ایک اور حوالے سے بھی نمایاں ہے، اور وہ ہے ہجرت اور کھلی سرحدوں کا معاملہ۔ کیا دنیا کے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ جہاں چاہے آزادانہ طور پر نقل و حرکت کر سکے اور آباد ہو سکے؟ ان تمام سوالات پر کلاسیکی لبرل نقطہ نظر کا جائزہ آئندہ ابواب میں لیا جائے گا۔

چھٹا باب

گروہ: اقوام، ریاستیں، خود مختاری اور ہجرت

کلاسیکی لبرلز افراد کو سماجی مخلوق سمجھتے ہیں جو گروہوں کی صورت میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ تو پھر بین الاقوامی میدان میں گروہ کیا کردار ادا کرتے ہیں؟ کلاسیکی لبرل بین الاقوامی تعلقات کو سمجھنے کے لیے اسے ایک اہم سوال سمجھتے ہیں۔ اس باب میں عالمی سیاست کے اہم ترین گروہوں کا تعارف کرایا جائے گا، اور ساتھ ہی ان مختلف طریقوں کا بھی جائزہ لیا جائے گا جن کے تحت ریاستوں کو بین الاقوامی سطح پر منظم کیا جا سکتا ہے۔ مزید برآں، کچھ اہم متعلقہ تصورات بھی زیرِ بحث آئیں گے: اقوام، ریاستیں اور ممالک؛ سلطنتیں اور وفاق؛ قومی فخر اور قوم پرستی کے تصورات؛ سفارت کاری کا کردار؛ اور خود مختاری کا نظریہ۔ آخر میں، ہجرت کے مسئلے، یعنی ایک گروہ کو چھوڑ کر دوسرے گروہ میں شامل ہونے کی خواہش، پر بھی بحث کی جائے گی۔

بین الاقوامی سیاست میں عموماً 'ہم' اور 'وہ' کا پہلو شامل ہوتا ہے، یعنی افراد کے مختلف گروہوں کے درمیان تعلقات۔ بین الاقوامی تعلقات میں شامل افراد تقریباً ہمیشہ گروہوں، خصوصاً ریاستوں، کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ریاستوں اور کلاسیکی لبرل ازم کے باہمی تعلق پر اکثر بحث نہیں کی جاتی، بالخصوص بین الاقوامی تعلقات (IR) کے تناظر میں تو بہت کم۔ اس حوالے سے ایک قابلِ ذکر استثنا کونوے (Conway 2004) ہیں، جن کا استدلال ہے کہ تمام انسانوں کی مساوی اخلاقی

حیثیت اور ان کے مخصوص قوم پرستانہ جذبات و وابستگیوں کے درمیان مطابقت پائی جاتی ہے۔
بعض قارئین کو یہ جان کر حیرت ہو سکتی ہے کہ کلاسیکی لبرل مفکرین ضروری نہیں کہ عالمی سیاست میں فرد ہی کو بنیادی کردار (actor) سمجھیں؛ بلکہ وہ قومی ریاست کو افراد اور ان کی آزادی کی نمائندگی کرنے والے ادارے کے طور پر بھی دیکھتے ہیں۔
بین الاقوامی میدان حکومتی اور غیر حکومتی بین الاقوامی کرداروں(actors) ، تنظیموں اور اداروں، نیز ملکی سطح کے کرداروں اور اداروں، اور ساتھ ہی بین الاقوامی و ملکی قوانین، نظاموں اور ضوابط کا ایک مجموعہ ہے۔ قومی نمائندے اکثر ان دونوں دائروں کے درمیان واسطے کا کردار ادا کرتے ہیں، تاہم بین الاقوامی بیوروکریسیوں میں بین الاقوامی بیوروکریٹس بھی موجود ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر، اب بھی زیادہ تر طاقت قومی ریاستوں کے پاس ہی ہے۔

قوم، ریاست، ملک

اس نکتے پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے، کیونکہ یہ بہت سی غلط فہمیوں کا باعث بنتا ہے: انسانی فطرت کے بارے میں کلاسیکی لبرل نقطۂ نظر انسانوں کو سماجی مخلوق سمجھتا ہے، نہ کہ ایسے تنہا اور گوشہ نشین افراد جو صرف اپنے بارے میں سوچتے اور اپنی ہی پروا کرتے ہوں جیسا کہ ان کے بعض ناقدین کا دعویٰ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی 'انفرادیت' کے باوجود افراد دوسروں کے ساتھ تعاون کرتے اور مختلف گروہ تشکیل دیتے ہیں۔
عام طور پر، کسی بھی فرد کے لیے بنیادی گروہ اس کا قریبی خاندان (core family) ہوتا ہے؛ یہ وہ فطری گروہ ہے جس میں انسان جنم لیتا ہے۔ یہ خاندان زندگی کے ابتدائی اور نسبتاً کمزور ادوار میں زیادہ تر افراد کو تحفظ اور سہارا فراہم کرتا ہے۔ خوش قسمتی سے، ٹوٹے ہوئے خاندانوں اور بدسلوکی یا دیگر سماجی مسائل کا شکار افراد اب بھی اقلیت میں ہیں۔ اس کے بعد افراد اپنے وسیع تر

خاندان(extended family) ، دوستوں، محلوں، دیہات، قصبوں، علاقوں یا صوبوں، اور بالآخر قوم یا ملک کے ساتھ ایسے تعلقات استوار کرتے ہیں جو بسا اوقات نسبتاً کمزور ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی اہمیت رکھتے ہیں۔

ہیوم (Hume) نے نشاندہی کی کہ اقوام تمام لوگوں میں جذبات ابھارتی ہیں، جن میں 'قومی فخر کا جذبہ' بھی شامل ہے۔ ان کا مشاہدہ تھا کہ شاذ و نادر ہی کوئی ایسا شخص ہوتا ہے جسے اپنی قوم سے کوئی لگاؤ نہ ہو؛ 1751 میں انہوں نے یہاں تک لکھا کہ: ''میں اپنے ملک کی خاطر خوشی خوشی سیاہی یا خون کا ایک قطرہ بھی بہادوں گا''(Hume 1932)۔ قوم کے ساتھ وابستگی کے جذبات انسانی رویے کے لیے—خواہ وہ مثبت ہوں یا منفی—تحریک کا ایک طاقتور ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود، انہوں نے اپنے مضمون 'آئیڈیا آف اے پرفیکٹ کامن ویلتھ (Idea of a Perfect Commonwealth)' میں خبردار کیا کہ: ''حکومت کے وہ تمام منصوبے جو انسانی طرزِ عمل میں کسی بڑی تبدیلی کا مفروضہ قائم کرتے ہیں، سراسر خیالی ہیں'' (Hume 1985)۔

سمتھ (Smith) نے بڑی حد تک اس بات سے اتفاق کیا اور اس امر پر زور دیا کہ اقوام باہمی ہمدردی کی بنیاد پر متحد رہتی ہیں۔ تاہم، ان کے نزدیک لوگوں کا فرض ہے کہ وہ رشتہ داروں، دوستوں اور اپنے ملک کو اسی ترتیب کے ساتھ اولیت دیں۔ ان کے نزدیک اپنے ملک سے محبت اور پوری انسانیت سے محبت دو مختلف چیزیں تھیں۔ پہلی قسم کی محبت فطری اور قابلِ عمل تھی، جبکہ دوسری قسم عام انسانوں کے لیے ممکن نہیں تھی اور اسے خدا پر چھوڑ دینا چاہیے۔ قوم یا ملک جو زبان اور/یا ثقافتی ورثے سے متعین ہونے والی ایک ثقافتی اکائی ہے وہ سب سے بڑا گروہ تھا جو انسانوں میں ہمدردی اور وابستگی کے جذبات کو بیدار کرتا تھا۔

انسان دنیا کے دوسرے حصوں میں رہنے والے لوگوں کے لیے ہمدردی یا افسوس کا احساس تو رکھ سکتا ہے، لیکن یہ جذبات اکثر عارضی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ سمتھ (Smith) نے چین میں

آنے والے ایک زلزلے کی مثال دی: ابتدا میں لوگ ایسی قدرتی آفت کے بارے میں سن کر صدمے یا حیرت میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن بہت جلد اپنی معمول کی زندگی کی طرف واپس لوٹ جاتے ہیں۔

اس کے برعکس، لوگوں کو اپنے آس پاس پیش آنے والے نسبتاً معمولی واقعات سے کہیں زیادہ سروکار ہوتا ہے۔ یہ قدیم مشاہدہ آج بھی درست ثابت ہوتا ہے، مثلاً دنیا کے مختلف حصوں میں آنے والی قدرتی آفات کے بارے میں ہمارے ردِ عمل میں۔ ابتدا میں ہمیں صدمہ پہنچتا ہے اور ممکن ہے کہ ہم امدادی کام کرنے والی کسی تنظیم کو کچھ رقم عطیہ بھی کر دیں، لیکن چند ہی دنوں بعد اس آفت کا ذکر ہماری روزمرہ گفتگو سے تقریباً غائب ہو جاتا ہے، حالانکہ متاثرہ لوگوں کے لیے اس کے اثرات بدستور سنگین اور حقیقی رہتے ہیں۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، میزس (Mises) نے قوم کے ساتھ وابستگی کے جذبات کو فرد کے مضبوط ترین جذبات میں شمار کیا اور قوم اور اس سے متعلقہ امور پر دو اہم کتابیں لکھیں: 'نیشن، اسٹیٹ اینڈ اکانومی (Nation, State and Economy) (1919) ' اور 'اومنی پوٹنٹ گورنمنٹ (Omnipotent Government) (1944) '۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی قوم پرستی کے منفی اثرات کا ذاتی تجربہ کیا، اس کے باوجود انہوں نے کبھی بھی 'قوم سے عاری دنیا (nationless world) ' کے تصور کی حمایت نہیں کی۔ ان کے نزدیک ترجیحی حل یہ تھا کہ ایسے گروہوں کو علیحدہ ہونے کا حق دیا جائے جو خود ایک آزاد ریاست تشکیل دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں؛ یوں وہ زیادہ تعداد میں ریاستوں پر مشتمل دنیا کے حامی تھے۔

ہائیک (Hayek) اس معاملے میں پوری طرح قائل نہیں تھے، تاہم وہ بھی قوم کے ساتھ جذباتی وابستگی کو انفرادی شناخت کا ایک اہم عنصر سمجھتے تھے۔ ہائیک کے نزدیک، بین الاقوامی سیاست میں 'قومی ریاست (nation-state) ' ہی بنیادی متعلقہ گروہ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ

یہ بات بنیادی اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ لوگ مختلف قومیت رکھنے والے گروہوں کی طویل مدتی بالادستی کو برداشت نہیں کریں گے۔

سمتھ (Smith) کی طرح، ہائیک کا بھی استدلال تھا کہ انسانی جذباتی وابستگیاں محدود ہوتی ہیں اور لوگ دور رہنے والے افراد کے لیے ذمہ داری کا گہرا احساس عموماً محسوس نہیں کرتے۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ بعض حالات میں مختلف اقوام کا نسبتاً امن اور نظم و ضبط کے ساتھ ایک ساتھ رہنا ممکن نہیں رہتا۔ ایسی صورتِ حال میں، ایک بین ریاستی وفاق (interstate federation) ممکنہ حل ہو سکتا ہے، مزید ملاحظہ کریں (Van de Haar 2022)۔

قوم اور ریاست ہمیشہ ایک ہی چیز نہیں ہوتیں۔ اگرچہ ان کے درمیان امتیاز کی لکیریں بعض اوقات مبہم ہو سکتی ہیں، لیکن عمومی طور پر ریاست ایک سیاسی اکائی ہوتی ہے، جبکہ قوم ایک ثقافتی مظہر۔ ریاست کی سرحدیں شاذ و نادر ہی قوم کی حدود سے مکمل طور پر مطابقت رکھتی ہیں۔ اکثر ایک ہی ریاست کے اندر متعدد اقوام آباد ہوتی ہیں، یا ریاستی سرحدیں ایسے مسائل کو جنم دیتی ہیں جو سرحدوں سے تجاوز کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں کردوں کی مثال پیش کی جا سکتی ہے، جو ایک ایسی قوم ہیں جن کی اپنی خود مختار ریاست نہیں۔

قدیم کلاسیکی لبرلز نے زیادہ تر 'پرانے مغربی یورپ' کو اپنے تجزیے کا مرکز بنایا، اگرچہ انہوں نے جاپان، چین اور سیام (موجودہ تھائی لینڈ) جیسی اقوام کو بھی زیرِ بحث لایا۔ تاہم، جرمنی اور اٹلی جیسے ممالک بھی انیسویں صدی کے اواخر تک متحد نہیں ہوئے تھے۔ ہر ریاست کی اپنی مخصوص تاریخ ہوتی ہے۔ ریاست اور قومی شناخت کے تصور کو دیومالائی داستانوں، رسمی تعلیم، قومی علامات کے فروغ اور مشترکہ قومی تاریخ کے تصور کے ذریعے تشکیل اور تقویت دی جاتی ہے۔

یہ بات بھی تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اقوام اور ریاستوں کے بارے میں ہماری موجودہ سمجھ بڑی حد تک 'یوروسینٹرک (Eurocentric)' ویسٹ فیلین تصورِ ریاست (Westphalian conception) پر مبنی ہے۔ دنیا کے دیگر حصوں، مثلاً افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ میں، متعدد

ریاستیں نوآبادیاتی طاقتوں کی جانب سے نقشوں پر نسبتاً من مانی لکیریں کھینچ کر تشکیل دی گئیں، جن میں اکثر مقامی نسلی، قبائلی اور دیگر گروہی وابستگیوں کو نظرانداز کیا گیا۔

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ بین الاقوامی معاملات میں گروہ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کلاسیکی لبرلز اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کی حمایت بھی کرتے ہیں، بشرطیکہ یہ گروہ انفرادی آزادی کے تحفظ اور فروغ کے لیے کام کریں یا اس مقصد کے لیے جدوجہد کریں۔ بہت سے کلاسیکی لبرلز کی نظر میں انسانی فطرت، ایک ثقافتی برادری کی حیثیت سے قوم، اور ریاست کے درمیان ایک فطری تعلق پایا جاتا ہے۔ دنیا پر ریاستوں کا غلبہ ہے اور بین الاقوامی تعلقات میں ریاستیں ہی بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ کلاسیکی لبرلز اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور ریاستوں کو بین الاقوامی سطح پر فطری سیاسی اکائیاں سمجھتے ہیں، کیونکہ بنیادی طور پر یہ اکائیاں انسانی جذباتی وابستگیوں سے جنم لیتی ہیں۔ بہت سے لوگ 'نوعِ انسانی سے محبت' کے مقابلے میں 'اپنے ملک سے محبت' کو ترجیح دیتے ہیں، جیساکہ سمتھ (Smith) کے تصور میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔

قومی فخر اور قوم پرستی

ممالک یا ریاستیں سیاسی اکائیاں تو ہیں ہی، لیکن وہ زیادہ تر لوگوں میں جذباتی وابستگی کا احساس بھی پیدا کرتی ہیں۔ دوسری طرف، جب کسی قوم کی تذلیل ہو مثلاً جنگ میں شکست کی صورت میں، تو اس کے نتیجے میں منفی جذبات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ سمتھ (Smith) کا خیال تھا کہ غیر ملکی سرزمین پر رہنے والے زیادہ تر لوگ اجنبیت یا بے وطنی کا احساس رکھتے ہیں، خواہ وہاں کے مقامی لوگ کتنے ہی شائستہ اور دوستانہ کیوں نہ ہوں۔ ہائیک (Hayek) کا بھی ماننا تھا کہ لوگ کسی دوسری قومیت رکھنے والے گروہ کی طویل مدتی بالادستی کو برداشت نہیں کرتے۔ اگرچہ یہ عمومی مشاہدات کچھ عرصہ پہلے کیے گئے تھے، لیکن ان میں بیان کیے گئے جذبات آج بھی بخوبی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

ہیوم (Hume) کا یہ نتیجہ کہ ''شاذ و نادر ہی کوئی ایسا شخص ملتا ہے جو کسی بھی دور میں اپنے ملک کے معاملے میں مکمل طور پر لاتعلق رہا ہو'' آج بھی درست معلوم ہوتا ہے۔ (Hume 2000)

کلاسیکی لبرلز کی نظر میں قوم کے ساتھ وابستگی کے ان جذبات کا، انیسویں صدی کے اواخر سے، غلط استعمال ہونے لگا، جب یہی جذبات قوم پرستی کے عروج کی بنیاد بن گئے۔ 'شوونزم' (Chauvinism) تو محض اپنی قوم کی خوبیوں اور کامیابیوں کو مبالغہ آمیز انداز میں بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا نسبتاً بے ضرر رجحان تھا۔ تاہم، قوم پرستی ایک اجتماعی نوعیت کا نظریہ ہے۔ یہ انفرادی آزادی کے مقابلے میں گروہی مفاد اور اجتماعی بہبود کو ترجیح دیتی ہے۔ اسی وجہ سے، قوم پرستی بین الاقوامی تعلقات کے کلاسیکی لبرل نظریے کا کبھی حصہ نہیں بن سکتی۔

خود مختاری اور سفارت کاری

ریاستیں ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح تعلق قائم کرتی ہیں؟ یہاں ہم خود مختاری (sovereignty) کے موضوع پر بات کر رہے ہیں، جس کی تعریف جیکسن (Jackson 2007) نے یوں کی ہے:

''یہ اختیار یا اقتدار کا وہ تصور ہے جو ان مخصوص علاقائی حدود کی حامل تنظیموں میں پایا جاتا ہے جنہیں ہم 'ریاستیں' کہتے ہیں، اور اس کا اظہار ان کے مختلف داخلی اور خارجی تعلقات اور سرگرمیوں میں ہوتا ہے۔''

اس تصور کی جڑیں سولھویں اور سترھویں صدی کے یورپ میں ہونے والے مذہبی اور سیاسی تنازعات اور جنگوں میں پیوست ہیں۔ جدید دور میں خود مختاری اختیار اور اقتدار کا بنیادی تصور بن چکی ہے اور بلاشبہ بین الاقوامی سیاست کے اہم ترین بنیادی تصورات میں سے ایک ہے۔

خود مختاری ایک ایسا تصور ہے جو ریاست کے اعلیٰ ترین اختیار اور جغرافیائی طور پر الگ الگ ریاستوں کی سیاسی و قانونی آزادی، دونوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ کسی مخصوص ریاست کے اندر حکومت اور شہریوں (یا رعایا) کے حقوق و فرائض سے متعلق ایک تصور ہے۔ تاہم، اس کا تعلق بین الا قوامی تعلقات سے بھی ہے۔ ریاستیں ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات قائم کرتی ہیں اور ہر ریاست اپنے مخصوص علاقے پر اختیار رکھتی ہے۔ وہ سفارت کاری (diplomacy) اور خارجی تعلقات کی دیگر صورتوں کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ معاملات طے کرتی ہیں۔

بہت سے کلاسیکی لبرلز خود مختاری کو اہم سمجھتے ہیں، کیونکہ یہ بنیادی طور پر جان، آزادی اور جائیداد کے تحفظ کا ایک ذریعہ ہے۔ ریاستوں کے نظام میں خود مختاری ایک ضابطہ کار اور نظم و ضبط قائم کرنے والے اصول کی حیثیت رکھتی ہے؛ ریاستوں کو ایک دوسرے کی خود مختاری کا احترام کرنا چاہیے تاکہ بین الا قوامی انتشار (anarchy) کو روکا جا سکے۔ یہ بین الا قوامی تعلقات میں ایک اہم ادارہ ہے جو ریاستوں اور ان کے باشندوں کو ایک دوسرے کی مداخلت اور تجاوز سے تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ، یہ بڑی یا زیادہ طاقتور ریاستوں کے مقابلے میں چھوٹی ریاستوں کے حقوق کے تحفظ میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہے۔

بلاشبہ، خود مختاری ہمیشہ ایک مثبت تصور نہیں ہوتی۔ ایسے حکمرانوں کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جو اپنے ممالک کا انتظام درست طریقے سے نہیں چلاتے اور اپنے شہریوں کی آزادیوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ایسے حکمران غیر ملکی حکومتوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ کسی بھی صورت مداخلت نہ کریں، کیونکہ ان کے بقول ایسا کرنا ان کی خود مختاری کی خلاف ورزی ہوگا۔ کلاسیکی لبرلز اس منفی پہلو کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن ان کا خیال ہے کہ مجموعی طور پر ایک مستحکم بین الا قوامی نظام کے فوائد — خصوصاً انفرادی آزادی کے فروغ کے حوالے سے — کسی مخصوص ملک کے باشندوں کو درپیش ان افسوسناک نقصانات سے کہیں زیادہ ہیں۔

بلاشبہ، اگر ریاستیں اپنے شہریوں پر ظلم کرتی ہیں یا انہیں ہلاک کرتی ہیں تو انہیں بیرونی فوجی مداخلت کے خطرے کا ہمیشہ سامنا رہتا ہے۔ اس مسئلے پر اگلے باب میں تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

سفارت کار خود مختار ریاستوں کے درمیان تعلقات برقرار رکھنے کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ سمتھ (Smith) اور ہیوم (Hume) نے ملکی رہنماؤں کے درمیان رابطے کے ذرائع کے طور پر سفیروں خواہ وہ مستقل طور پر تعینات ہوں یا کسی مخصوص مقصد کے لیے دورے پر آئے ہوں، کے کردار کو اہمیت دی۔ اپنے فرائض مؤثر انداز میں انجام دینے کے لیے سفیروں کو خصوصی حقوق اور استثنیٰ (immunities) حاصل ہونا چاہیے۔

جیسا کہ واٹسن (Watson 1982) نے نشاندہی کی، سفارت کاری محض مستقل سفارت خانوں اور پیشہ ورانہ سفارتی خدمات تک محدود نہیں ہے۔ آج بین الاقوامی مکالمے میں متعدد دیگر ذرائع اور فریقین بھی شامل ہیں، جن میں غیر سرکاری تنظیمیں (NGOs) بھی شامل ہیں۔ اس کے باوجود سفارت کاروں نے اپنی اہمیت اور افادیت برقرار رکھی ہے۔ اگرچہ ہماری جدید دنیا—خصوصاً نقل و حمل، ذرائع ابلاغ، سربراہانِ حکومت کی ملاقاتوں اور مواصلات کے دیگر ذرائع کے حوالے سے—ماضی سے بہت مختلف ہے، لیکن سفارت کاروں کا بنیادی کردار بڑی حد تک وہی رہا ہے۔

سفارت کار ایسے دروازے کھولتے ہیں جو دوسروں کے لیے بند رہتے ہیں اور ریاستوں کے درمیان تعلقات کو ہموار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اعلیٰ ترین حکومتی حلقوں تک رسائی کے باعث وہ قومی مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے غلط فہمیوں کو دور کرنے، تنازعات کو کم کرنے اور ریاستوں کے درمیان بہتر افہام و تفہیم پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

سلطنت

دنیا کے مختلف حصوں پر طویل عرصے تک سلطنتوں کا غلبہ رہا ہے۔اس کی مثالوں میں چین اور منگول سلطنتیں، نیز لاطینی امریکہ کی وہ سلطنتیں شامل ہیں جن پر بعد میں ہسپانوی اور پرتگالی سلطنتوں نے قبضہ کر لیا۔ تاریخی طور پر یورپی سلطنتیں سب سے زیادہ غالب رہی ہیں اور ان کے اثرات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں، مثلاً کیریبین میں موجود فرانسیسی، برطانوی اور ڈچ جزائر کی صورت میں۔ انیسویں صدی میں 'افریقہ پر قبضے کی دوڑ (Scramble for Africa) ' کے دوران جرمنوں، اطالویوں اور بیلجیئم کے باشندوں نے بھی نوآبادیاتی توسیع میں اہم کردار ادا کیا، جبکہ روسی سلطنت نے اپنی توسیع زیادہ تر خشکی کے راستے کی۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، امریکی آزادی کے اس اہم دور کے مسئلے پر ہیوم (Hume) اور سمتھ (Smith) نے امریکیوں کی حمایت کی تھی۔ دونوں کا ماننا تھا کہ دوسرے لوگوں پر غلبہ حاصل کرنا درست عمل نہیں ہے۔ وہ دنیا کے دیگر حصوں میں یورپی طاقتوں کی جانب سے قائم کی جانے والی سلطنتوں کے بھی حامی نہیں تھے، اگرچہ وہ ان کے شدید مخالف بھی نہیں تھے۔

سمتھ نے اجارہ دار تجارتی کمپنیوں، مثلاً 'ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی (Dutch East India Company) ' کے خلاف دلائل دیے۔ یہ کمپنیاں عملی طور پر یورپی سلطنتوں کے بڑے حصوں پر حکمرانی کرتی تھیں اور مقامی باشندوں کے ساتھ ناروا سلوک کرتی تھیں۔ ان کی توجہ بنیادی طور پر اپنے تجارتی مفادات پر مرکوز رہتی تھی اور انہیں مقامی آبادی کی فلاح و بہبود کی کوئی خاص پرواہ نہیں تھی۔

بیسویں صدی میں، جنگِ عظیم دوم کے بعد نوآبادیاتی نظام کے خاتمے (decolonization) کے دور میں، ہائیک (Hayek) اور میزس (Mises) نے قوم پرستی اور سلطنت کے درمیان ایک واضح تعلق دیکھا۔ جو لوگ سلطنت کو برقرار رکھنے کے حامی

تھے، وہ اکثر 'مادرِ وطن کی عظمت برقرار رکھنے' کا جواز پیش کرتے تھے۔ یہ ایک اجتماعی (collectivist) طرزِ فکر ہے جسے کلاسیکی لبرلز مسترد کرتے ہیں۔

سابقہ نوآبادیات اور ان کی سابقہ نوآبادیاتی طاقتوں کے درمیان تعلقات کا انحصار سلطنت کو برقرار رکھنے پر نہیں ہونا چاہیے۔ دوسری قوموں اور ان کے شہریوں پر حکمرانی کرنا، اور ان کے قدرتی وسائل پر قبضہ کرنا، ایک غلط عمل ہے۔ یہ بنیادی طور پر غیر اخلاقی ہے، اور کلاسیکی لبرلز تاریخی طور پر اسی وجہ سے سامراج اور نوآبادیاتی غلبے کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔

مزید برآں، کلاسیکی لبرل مفکرین اس بات کے قائل نہیں کہ دنیا میں کوئی ایسے 'اعلیٰ ترین' ممالک موجود ہیں جنہیں دوسروں پر حکمرانی کرنے کا حق حاصل ہو؛ بالکل اسی طرح جیسے وہ ملکی سطح پر ایسے 'فطری رہنماؤں' کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کرتے جنہیں دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کا حق حاصل ہو۔ چنانچہ، بین الاقوامی تعلقات میں ریاستوں کے درمیان لین دین کی بنیاد صرف رضاکارانہ معاہدوں اور باہمی رضامندی پر ہونی چاہیے۔

اس تناظر میں، کلاسیکی لبرل ماہرِ معاشیات دیپک لال (Deepak Lal) کی کتاب In Praise of Empires (2004) میں پیش کیا گیا نقطۂ نظر کچھ حد تک حد سے زیادہ مثبت محسوس ہوتا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے سلطنتوں کے اس 'مثبت کردار' کو اجاگر کیا ہے جس کے ذریعے، ان کے خیال میں، انہوں نے امن اور خوشحالی کے لیے ضروری نظم وضبط قائم کیا۔

ممکن ہے کہ تاریخ کے بعض ادوار میں کچھ سلطنتوں کے بارے میں یہ بات کسی حد تک درست ہو۔ یہ حقیقت بھی آسانی سے نظرانداز ہو جاتی ہے کہ مغربی سلطنتوں نے، کم از کم بعض لوگوں کے لیے، معیاری تعلیم، صحت کی سہولیات اور بنیادی ڈھانچہ متعارف کرایا۔ تاہم، اسی تاریخ میں جبر واستبداد، استحصال اور مقامی ثقافتوں کی تذلیل و پامالی کی متعدد مثالیں بھی موجود ہیں۔ دوسروں پر من مانی حکمرانی اور غلبہ حاصل کرنا کبھی بھی کلاسیکی لبرل بین الاقوامی فکر کا حصہ نہیں ہو سکتا۔

وفاق

اگرچہ بہت سے کلاسیکی لبرلز کے نزدیک عالمی سیاست میں ریاست ہی بنیادی کردار ادا کرتی ہے، لیکن ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں جب خود مختار ریاستیں پر امن انداز میں باہمی تعلقات برقرار رکھنے میں ناکام رہیں اور بالآخر جنگ کی طرف مائل ہو جائیں۔ ایسی صورتِ حال میں کلاسیکی لبرلز کے نزدیک وفاق کا قیام ایک بہتر حل ہو سکتا ہے، جس میں قومی ریاستیں اپنے بعض اختیارات خواہ وہ معاشی ہوں، عسکری ہوں، سیاسی ہوں یا ان تینوں کا مجموعہ مشترکہ طور پر استعمال کرتی ہیں۔ اس کا مقصد نہ تو عالمی حکومت قائم کرنا ہے اور نہ ہی قومی ریاستوں کو ختم کرنا، بلکہ بین الاقوامی استحکام کے حصول کے لیے ریاستوں کے درمیان ایک وفاقی نظام قائم کرنا ہے۔

وفاق کی کئی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ فرانس اور جرمنی کی مثال میں یہ بات واضح تھی کہ تقریباً 80 برس کے عرصے میں تین جنگوں (1870، 1914 اور 1940) کے بعد کسی ٹھوس اقدام کی ضرورت تھی۔ دونوں ممالک کے درمیان تعاون کو ادارہ جاتی شکل دینے کے لیے 'یورپی کمیونٹیز' (European Communities) کا قیام اسی سمت میں ایک اہم قدم تھا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، ہائیک (Hayek) اور میزس (Mises) دونوں نے دوسری جنگِ عظیم سے پہلے اور اس کے بعد بھی اس مسئلے پر تفصیل سے لکھا (Van de Haar 2022)۔ میزس نے مشرقی یورپ کے لیے وفاقی نظام کے مختلف منصوبے پیش کیے، ایک عرصے تک 'پین-یورپین تحریک (Pan-European Movement)' کے سرگرم رکن رہے، اور مغربی یورپ کے لیے بھی وفاقی منصوبوں کی حمایت کی، بشرطیکہ یہ وفاق ٹھوس معاشی اصولوں پر مبنی ہوں، ان میں تجارتی رکاوٹیں موجود نہ ہوں اور ایک بہت بڑی وفاقی حکومت کا قیام عمل میں نہ آئے۔

ہائیک نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور اپنی پوری زندگی وفاق کی افادیت پر گہرا غور و فکر کیا۔ ان کی تجاویز میں مشرقِ وسطیٰ کے تناظر میں وفاقی نظام کے امکانات بھی شامل تھے۔ انگلستان میں وفاق کے بارے میں بحث کی جڑیں انیسویں صدی کے اواخر میں پیش کی جانے والی ان تجاویز تک پہنچتی ہیں جن کا مقصد برطانوی سلطنت کو کسی وفاقی نظام میں تبدیل کرنا تھا۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ کلاسیکی لبرل نقطۂ نظر میں وفاق اگرچہ ہمیشہ ایک مثالی حل نہیں ہوتا یعنی بعض حالات میں یہ 'سب سے بہتر ممکنہ حل (suboptimal solution) 'نہ بھی ہو لیکن اسے 'آخری چارۂ کار (last-resort solution) 'کے طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے، خصوصاً اس وقت جب قوم پرستی، مذہب یا دیگر عوامل قومی ریاستوں پر مبنی بین الاقوامی نظام کے استحکام کے لیے سنگین خطرہ بن جائیں۔

یہ بات بھی تسلیم کی جانی چاہیے کہ بین الاقوامی انتشار کے حل کے لیے 'کلاسیکی لبرل وفاقی ' (classical liberal federal)طریقۂ کار کو عملی جامہ پہنانا آسان نہیں۔ نچلی سطح سے اوپر کی جانب (bottom-up) خود مختاری کو یکجا کرنے کا عمل عملی طور پر نہایت پیچیدہ ثابت ہوتا ہے، اور خود کلاسیکی لبرلز بھی اس بارے میں ہمیشہ ایک دوسرے سے متفق نہیں ہوتے۔

بعض کلاسیکی لبرلز کے نزدیک یورپی یونین اس کی ایک عمدہ مثال ہے، کیونکہ یہ آزاد منڈی کے فروغ (market liberalization) کے لیے خود مختار ریاستوں کے درمیان وفاقی تعاون اور باہمی اشتراک کا ایک منفرد امتزاج بن چکی ہے۔ تاہم، دیگر کلاسیکی لبرلز کے نزدیک یورپی یونین ایک بیوروکریٹک، تحفظ پسند(protectionist) ، اوپر سے نیچے کی جانب (top-down)مسلط کیا جانے والا اور غیر لبرل منصوبہ بن چکی ہے۔ اس اختلاف کا واضح اظہار برطانیہ کے یورپی یونین سے علیحدگی کے ریفرنڈم کے دوران ہوا، جب بعض کلاسیکی لبرلز یورپی یونین میں برقرار رہنے کے حق میں تھے، جبکہ دیگر اس سے علیحدگی کی حمایت کر رہے تھے۔

جنوب مشرقی ایشیا میں آسیان (ASEAN) کا ارتقاء بھی اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ علاقائی تنظیموں کو ایسی مؤثر تنظیموں میں تبدیل کرنا کتنا مشکل ہے جو بار بار ہونے والے عسکری تنازعات پر قابو پا سکیں۔ 'نچلی سطح سے اوپر کی جانب (bottom-up) 'طریقۂ کار، جس میں ریاستوں کی خودمختاری کا سختی سے احترام کیا جاتا ہے، بیشتر بین الاقوامی علاقائی تنظیموں کی بنیاد فراہم کرتا ہے، لیکن ضروری نہیں کہ اس کے نتیجے میں کوئی وفاقی نظام بھی قائم ہو۔
کچھ، اگرچہ تمام نہیں، کلاسیکی لبرلز تنازعے کے خاتمے کے بعد، یا تنازعے کے حل اور امن کے کسی منصوبے کے حصے کے طور پر، 'اوپر سے نیچے کی جانب (top-down) 'طریقۂ کار کو 'کم سے کم برا (least worst) 'حل یا متبادل سمجھتے ہیں۔ یہ امر اس بنیادی حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ خودمختار ریاستوں پر مبنی دنیا کے کلاسیکی لبرل اصول کے تناظر میں 'وفاقی نظام کا قیام ' (federalization) عموماً ایک استثنائی صورت ہی ہوتا ہے۔

امیگریشن(Immigration)

چونکہ کلاسیکی لبرلز (classical liberals) منفی انسانی حقوق کا دفاع کرتے ہیں، اس لیے یہ سوال زیرِ بحث آتا رہا ہے کہ آیا آزادیِ نقل و حرکت میں ریاستی سرحدوں کے آر پار آزادانہ نقل و حرکت کا حق بھی شامل ہونا چاہیے۔ فی الحال، بین الاقوامی قانون کے تحت ریاستوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ہجرت کو روکیں یا اس پر پابندیاں عائد کریں، لیکن کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ کلاسیکی لبرلز کے لیے اس سوال کا جواب بڑی حد تک آزادیِ نقل و حرکت اور حقِ ملکیت کے درمیان ایک توازن یا سمجھوتے (trade-off) کے مسئلے کے طور پر سامنے آتا ہے۔ یہ موضوع خود کلاسیکی لبرلز کے درمیان، اور کلاسیکی لبرلز اور لبرٹیرینز (libertarians) کے درمیان بھی مسلسل بحث کا باعث رہا ہے (باب 10 ملاحظہ کریں)۔

اگرچہ آزادانہ ہجرت اور کھلی سرحدوں کا مسئلہ آج ایک اہم موضوع ہے، لیکن یہ کوئی نیا سوال نہیں۔ میزس (Mises) (1927) نے لبرل نقطۂ نظر سے اس بحث کے بنیادی خدوخال بہت پہلے واضح کر دیے تھے۔ ان کے مطابق، ایک لبرل کے نزدیک ہر شخص کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ جہاں چاہے رہ سکے، کیونکہ یہ پیداواری ذرائع کی نجی ملکیت پر مبنی معاشرے کے بنیادی اصولوں میں شامل ہے۔ ان کا استدلال تھا کہ معاشی بنیادوں پر ہجرت کی پابندیوں کو جائز قرار دینے کی کوششیں ابتدا ہی سے ناقابلِ دفاع تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نقل مکانی پر عائد پابندیاں انسانی محنت کی پیداواری صلاحیت کو کم کرتی ہیں۔

تاہم، میزس نے تسلیم کیا کہ یہ مسئلہ صرف معاشیات تک محدود نہیں۔ جو لوگ ایسی ریاستوں میں رہتے ہیں جو ممکنہ تارکینِ وطن کے لیے پرکشش ہوتی ہیں، وہ غیر ملکیوں کی بڑی تعداد میں آمد کے امکان کو اپنے لیے خطرہ سمجھ سکتے ہیں۔ بعض حالات میں ہجرت کے نتیجے میں مقامی آبادی کو یہ احساس بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی ہی سرزمین پر اقلیت بن گئی ہے۔

میزس نے آسٹریلیا کی مثال پیش کی، جہاں پڑوسی ایشیائی ممالک سے ہجرت کے لیے دروازے کھولنے کا سوال پیدا ہوا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ امریکہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں یورپ سے آنے والے تارکینِ وطن کی بڑی تعداد کو صرف اس لیے جذب کر سکا کیونکہ یہ گروہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ امریکی ثقافت میں انضمام کا عمل ناممکن ہو جاتا۔ انہوں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ بعد میں امریکہ نے ہجرت سے متعلق سخت قوانین متعارف کرا دیے۔

ایسی دنیا میں جہاں بعض ریاستیں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہوں، یہ بات قابلِ فہم ہے کہ کسی قومی اقلیت کو یہ خدشہ لاحق ہو کہ مختلف قومیت کی اکثریت اس کے ساتھ امتیازی یا جابرانہ سلوک کر سکتی ہے۔ اگرچہ میزس کا نقطۂ نظر بنیادی طور پر یورپی تجربے پر مرکوز تھا، لیکن یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ آسٹریلیا، براعظمِ امریکہ اور دنیا کے دیگر حصوں میں یورپی نوآبادیاتی باشندوں کی

آمد اور مقامی آبادیوں پر اس کے اثرات ان خدشات کو کسی حد تک درست ثابت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

میزس کا ماننا تھا کہ تارکینِ وطن کی بڑی تعداد سے متعلق ان خدشات کا بنیادی حل ایک مکمل طور پر لبرل ریاست کا قیام ہے — یعنی ایسی ریاست جس کی ذمہ داریاں اور اختیارات محدود ہوں۔

تاہم، جب تک ایسی محدود اختیارات کی حامل ریاستیں (limited states) موجود نہیں ہوتیں، بعض کلاسیکی لبرلز کے نزدیک آزادانہ نقل مکانی (امیگریشن) کا مطالبہ انفرادی آزادی کے لیے ممکنہ خطرہ بن سکتا ہے نہ صرف ان افراد کی آزادی کے لیے جو نقل مکانی کرنا چاہتے ہیں، بلکہ ان آبادیوں کی آزادی کے لیے بھی جو پہلے سے ان ممالک میں مقیم ہیں۔ اس پہلو کو اکثر نظر انداز یا مسترد کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ وان ڈیر ووسن اور برینن (2018)، سومن (2020)، لوماسکی اور ٹیسون (2015) اور کوکاتھاس (2021) جیسے لبرل مصنفین کے کام میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بعض مصنفین کو کلاسیکی لبرل بھی سمجھا جاتا ہے۔

اگرچہ ان کے مخصوص دلائل میں اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن وہ اس بات پر متفق ہیں کہ غریب ممالک کے افراد کو امیر ممالک میں آزادانہ طور پر نقل مکانی کی اجازت دینا بہتر ہے، تاکہ وہ یہ فیصلہ کر سکیں کہ کہاں رہنا ہے اور اپنی بہترین ممکنہ زندگی گزارنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو کہاں بروئے کار لانا ہے۔ ان کے نزدیک یہ عمل اخلاقی طور پر درست ہے۔ وہ خود تارکینِ وطن کے لیے قلیل مدتی معاشی فوائد کی بھی نشاندہی کرتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی معاشی حالت فوری طور پر بہتر بنا سکتے ہیں، خواہ انہیں میزبان ملک میں کم آمدنی والے یا پسماندہ طبقے کا حصہ ہی کیوں نہ بننا پڑے۔ درمیانی اور طویل مدت میں میزبان ملک بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے، کیونکہ تارکینِ وطن معاشی سرگرمی اور ترقی میں اپنا حصہ ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کا مزید استدلال ہے کہ ایسے ممکنہ طریقہ کار بھی موجود ہیں جن کے ذریعے آزادانہ نقل مکانی سے وابستہ دیگر اخراجات، مثلاً سماجی بہبود اور صحت کی سہولیات کے اخراجات، کی تلافی کی جا سکتی ہے۔

میزس (Mises) کے پیش کردہ جوابی دلائل کے علاوہ، ایک اور مسئلہ بھی موجود ہے جسے شاید آسٹرین مفکرین نے نظر انداز کیا: کلاسیکی لبرل 'محدود ریاست (limited state)' کا تصور فطری حقوق پر عائد بعض جائز پابندیوں کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، یہ حقوق مطلق یا غیر مشروط نہیں ہوتے۔ چنانچہ نقل مکانی کے حق کو محدود کرنا لازماً 'غیر لبرل' عمل نہیں ہے۔
کلاسیکی لبرل فلسفی ڈیوڈ کونوے (David Conway) آزادانہ نقل مکانی کے حق میں پیش کیے جانے والے بہت سے دلائل کو محتاط انداز میں رد کرتے ہیں(Conway 2004) ۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایسا کوئی مضبوط لبرل اصول موجود نہیں جو ریاستوں کو اس بات کا پابند بناتا ہو کہ وہ شہریوں اور تارکینِ وطن کے ساتھ یکساں احترام اور مساوی توجہ کا برتاؤ کریں۔ وہ اس دعوے کو بھی مسترد کرتے ہیں کہ غیر ملکیوں کو کسی دوسری ریاست کی حدود میں واقع عوامی مقامات تک رسائی کا کوئی اخلاقی حق حاصل ہے، جب تک کہ اس ریاست کی صریح یا ضمنی رضامندی موجود نہ ہو۔

کونوے کے مطابق، ایسے عوامی مقامات کو ان ریاستوں کے شہریوں کی مشترکہ ملکیت تصور کیا جا سکتا ہے، جن کے مفادات کی نمائندگی ریاست ایک 'نمائندے' (proxy) کے طور پر کرتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے، تارکینِ وطن کو اپنی مرضی سے کسی دوسرے ملک میں داخل ہونے کا حق اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا جتنا کسی شہری کو اپنے ہی ہم وطنوں کی نجی ملکیت میں ان کی رضامندی کے بغیر داخل ہونے کا حق حاصل ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کہیں بھی کوئی مکمل طور پر 'کلاسیکی لبرل (classical liberal) ' ریاست موجود نہیں ہے۔ ملٹن فریڈمین (Milton Friedman) نے 1978 میں یہ نکتہ اٹھایا تھا کہ جہاں فلاحی ریاست موجود ہو خواہ وہ محدود پیمانے ہی پر کیوں نہ ہو وہاں آزادانہ ہجرت (free immigration) ان فلاحی انتظامات پر اضافی بوجھ ڈالتی ہے۔ اس صورتِ حال میں فلاحی ریاست کے موجودہ ڈھانچے کو برقرار رکھنا مشکل، بلکہ بعض حالات میں ناممکن، ہو سکتا ہے۔

موجودہ دور کے بعض مصنفین تلافی کے منصوبوں (compensation schemes) کے ذریعے اس دلیل کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن وہ اکثر اس پہلو کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ ہجرت کو میزبان آبادی کے 'ملکیتی حقوق (property rights)' کی خلاف ورزی کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے؛ کیونکہ اس آبادی نے ان خدمات کے لیے پریمیم ادا کیے ہوتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ان خدمات سے متعلق مخصوص حقوق قائم کیے ہوتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے، غیر محدود ہجرت (unlimited immigration) کو فلاحی انتظامات سے وابستہ ان ملکیتی حقوق کی خلاف ورزی تصور کیا جا سکتا ہے۔

نظریاتی طور پر تلافی کا کوئی طریقہ وضع کیا جا سکتا ہے، لیکن عملی طور پر اس کی لاگت بالآخر میزبان آبادی ہی کو برداشت کرنا پڑتی ہے — یا تو زیادہ لازمی پریمیم کی صورت میں، یا پھر فلاحی خدمات تک کم رسائی کی صورت میں، کیونکہ انہی محدود وسائل سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے مناسب اور منصفانہ تلافی کے عملی امکانات زیادہ واضح نہیں ہیں۔

عام طور پر، ہجرت کی بحث میں میزبان آبادی کے نقطۂ نظر کو بھی اتنی اہمیت نہیں دی جاتی جتنی دی جانی چاہیے۔ مثال کے طور پر، ہائیک (Hayek) نے ویانا میں اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر متعدد مضامین میں یہ استدلال پیش کیا کہ تارکینِ وطن کی بڑی تعداد میں آمد میزبان آبادی کی ثقافت اور طرزِ زندگی پر گہرے اثرات مرتب کر سکتی ہے۔ اس کے نتیجے میں احتجاج اور قوم پرستانہ ردعمل پیدا ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ایسے ردعمل کا اخلاقی دفاع شاید ممکن نہ ہو، لیکن ان کے اسباب کو کسی حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا نکات کو ہر قسم کی ہجرت کے خلاف دلیل نہیں سمجھنا چاہیے۔ ان کا مقصد محض اس خیال کے مقابلے میں ایک زیادہ متوازن نقطۂ نظر پیش کرنا ہے کہ کلاسیکی لبرل کو لازماً معاشی اور اخلاقی بنیادوں پر غیر محدود ہجرت کی حمایت کرنی چاہیے۔ اگرچہ بعض کلاسیکی لبرلز ایسا کرتے ہیں، لیکن

دیگر ایسے بھی ہیں جو ملکیتی حقوق، ثقافتی تسلسل، اور اقلیت و اکثریت کے باہمی تعلق جیسے عوامل کو مد نظر رکھتے ہوئے غیر محدود ہجرت کی حمایت نہیں کرتے۔

بہت سے مغربی ممالک تارکینِ وطن کی ایک محدود تعداد کا خیر مقدم کرتے ہیں، جس کا انحصار بعض اوقات اس بات پر ہوتا ہے کہ آیا وہاں افرادی قوت کی کمی ہے یا آبادی تیزی سے عمر رسیدہ ہو رہی ہے۔ اسی طرح، جنگ اور ظلم و ستم سے فرار ہونے والے پناہ گزینوں کو قبول کرنے کے حق میں ایک مضبوط اخلاقی دلیل بھی موجود ہے۔

ان معاملات سے قطع نظر، کلاسیکی لبرلز ہجرت کے حوالے سے مطلوبہ کھلے پن کی سطح پر ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، بہت سے یورپی کلاسیکی لبرلز یورپی یونین کے اندر نقل و حرکت کی آزادی کا خیر مقدم کرتے ہیں، لیکن یورپی یونین سے باہر کے ممالک سے محدود پیمانے پر ہجرت کے حق میں ہوتے ہیں۔ بلاشبہ، ہجرت اور سرحدوں کی یہ بحث مستقبل قریب میں بھی ایک اہم موضوع بنی رہے گی۔

ساتواں باب

تشدد: طاقت کا توازن، جنگ اور عسکری مداخلت

انسانی فطرت پر مبنی باب میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ افراد اور گروہ بعض اوقات باہمی تنازعات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس باب میں اس سوال کا جائزہ لیا جائے گا کہ بین الاقوامی معاملات میں تشدد کا کیا کردار ہے، اگر کوئی ہے، اور اس سے کیسے نمٹا جانا چاہیے۔

اس میں بین الاقوامی امور اور ریاستوں کے باہمی تعلقات خصوصاً طاقت کے توازن اور جنگ کے تناظر کے حوالے سے 'کلاسیکی لبرل (classical liberal) 'نقطۂ نظر پر بحث کی جائے گی۔ اس کے بعد جنگ کی قیمت اور اس کے نقصانات کے بارے میں کلاسیکی لبرلز کے مخصوص مؤقف کا جائزہ لیا جائے گا۔ باب کا اختتام عسکری مداخلت کے ممکنہ فوائد اور نقصانات پر ہونے والی بحث سے ہو گا۔

بہت سے لوگ ان موضوعات کو بین الاقوامی تعلقات کے بنیادی اور پیچیدہ مسائل میں شمار کرتے ہیں، اگرچہ لبرل ازم کے نقطۂ نظر سے یہ لازماً بنیادی نوعیت کے مسائل نہیں ہیں؛ ان پر حصہ سوم میں مزید بحث کی جائے گی۔

تاہم، اگر ریاستی خود مختاری کا احترام نہ کیا جائے، ریاستوں کے درمیان پر تشدد تنازعہ پھوٹ پڑے، یا کوئی حکمران اپنے ہی عوام کے خلاف سنگین جرائم کا ارتکاب کرے، تو دوسرے ممالک کو کیا کرنا چاہیے؟ یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جن کا جائزہ اس باب میں لیا جائے گا۔

عالمی سیاست کے بارے میں نقطۂ نظر

عالمی سیاست کے بارے میں کلاسیکی لبرلز (Classical Liberals) کا نقطۂ نظر انسانی فطرت کے بارے میں ان کے خیالات سے ہم آہنگ ہے۔ اس حوالے سے سب سے اہم مشاہدہ یہ ہے کہ کوئی ایسی بالادست طاقت یا عالمی منصف موجود نہیں جو یہ طے کرے کہ بین الاقوامی معاملات میں کیا کیا جانا چاہیے یا بنیادی اصول کیا ہونے چاہئیں۔ بلاشبہ، بین الاقوامی قانون، عدالتیں اور ٹربیونلز موجود ہیں، لیکن یہ سمجھنا ضروری ہے کہ موجودہ بین الاقوامی قانونی اداروں میں سے کسی کے پاس بھی اپنے فیصلوں پر عمل درآمد یقینی بنانے کا حتمی اختیار نہیں ہے۔ بالآخر معاملہ ریاستوں، ان کے باہمی تعاون کے عزم، اور دیگر فریقین (actors) کے رویوں پر منحصر ہوتا ہے۔
کسی اعلیٰ ترین اتھارٹی یا بالادست حکمران کے بغیر دنیا میں تمام ریاستوں کو 'سیکیورٹی کے مخمصے' (security dilemma) کا سامنا رہتا ہے (بوتھ اور وہیلر 2008)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاستیں کسی مستحکم اور پُرامن بین الاقوامی نظام کے مستقل وجود پر انحصار نہیں کر سکتیں، خواہ ایسا نظام انسانی فلاح و بہبود کے لیے کتنا ہی موزوں کیوں نہ ہو۔ ہمیشہ یہ خطرہ موجود رہتا ہے کہ کوئی ریاست، یا ریاستوں کا کوئی گروہ، عالمی حکومت کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ چنانچہ سیکیورٹی کا مخمصہ ریاستوں کے لیے بقا کا ایک بنیادی مسئلہ (existential problem) بن جاتا ہے۔

اگر ریاستیں اپنی بقا چاہتی ہیں تو انہیں اپنی سلامتی کا خود خیال رکھنا پڑتا ہے، اور اس میں سب سے اہم عنصر عسکری تحفظ ہے۔ رہنما اور اشرافیہ کبھی بھی دوسری ریاستوں کے رہنماؤں کے ارادوں کے بارے میں مکمل یقین نہیں رکھ سکتے، خواہ خود ان کا دوسری ریاست کو نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔ اسی طرح، خالصتاً اپنے دفاع کے لیے حاصل کیے گئے ہتھیار بھی دوسری ریاستوں کو جارحانہ اقدام کی تیاری کے طور پر دکھائی دے سکتے ہیں۔ غیر یقینی صورتحال سے بھرپور دنیا میں تاثرات (perceptions) بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ملکی سیاست کی طرح، کلاسیکی لبرلز ایک درمیانی راستہ تلاش کرنے کے خواہاں ہیں، جس میں ریاستیں کسی حد تک نظم و ضبط قائم رکھیں، لیکن ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی تسلیم کیا جائے کہ کسی نہ کسی درجے میں انتشار یا نظم و ضبط کا فقدان ہمیشہ موجود رہے گا۔ جیسا کہ حصہ سوم میں دیکھا جائے گا، کلاسیکی لبرلز 'ریاستوں کے انتشار پسندانہ معاشرے (anarchical society of states)' کے تصور کی حمایت کرتے ہیں، جس کی اصطلاح بین الاقوامی تعلقات کے آسٹریلوی نظریہ دان ہیڈلی بُل (Hedley Bull) نے استعمال کی تھی (Bull 1995)۔

اس صورتِ حال میں ریاستوں کے مابین طاقت پر مبنی تعلقات، بین الاقوامی قانون، اور بین الاقوامی تعاون جیسی بنیادی سماجی خصوصیات بیک وقت موجود رہتی ہیں۔ یہ امتزاج ریاستوں کو نسبتاً منظم انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے قابل بناتا ہے اور ساتھ ہی ان کے سلامتی سے متعلق مسائل، یعنی سیکیورٹی ڈائلماز (security dilemmas)، سے نمٹنے کا ایک طریقہ بھی فراہم کرتا ہے۔

یوں یہ ریاستوں کے مابین ایک سیاسی معاشرہ ہے، نہ کہ ایسا کثیر الفریق بین الاقوامی معاشرہ جس میں تمام فریقین (actors) مساوی حیثیت کے حامل ہوں۔

طاقت کا توازن

بین الاقوامی دنیا کی ایک نمایاں خصوصیت 'انارکی (anarchy) ' یا انتشار کی کیفیت ہے، یعنی کسی حد تک نظم و ضبط کا فقدان۔ چونکہ یہ انفرادی آزادی کے لیے ایک ممکنہ خطرہ بن سکتی ہے، اس لیے کلاسیکی لبرلز (classical liberals) ایسے اقدامات کو ترجیح دیتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ بین الاقوامی نظم و ضبط اور تعاون کو فروغ دیں۔ وہ کلاسیکی لبرل ازم کی بنیادی اقدار کو درپیش دو ممکنہ خطرات کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک خطرہ خالص انارکی ہے، جسے یہاں 'طاقتور ترین کی حکمرانی (rule of the strongest) ' کے طور پر سمجھا گیا ہے، جہاں زندگی، آزادی اور جائیداد کے حقوق کا کوئی بامعنی یا پائیدار تحفظ موجود نہیں ہوتا۔ دوسرا خطرہ انسانیت کو ایک ہی طاقت کے تحت متحد کرنے کی کوشش ہے، جیسا کہ ہابس (Hobbes) کے تصورِ 'لیوایتھن (Leviathan) ' یا 'عالمی ریاست (world state) ' میں نظر آتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اہم عنصر 'طاقت کا توازن (balance of power) ' ہے۔ بُل (Bull 1995) نے اسے ایک 'ادارہ (institution) ' قرار دیا، اور یہ بہت سے کلاسیکی لبرلز کے نزدیک بین الاقوامی نظم و ضبط برقرار رکھنے کا ایک پسندیدہ ذریعہ رہا ہے۔ ہیوم (Hume) نے اس موضوع پر ایک معروف مضمون تحریر کیا، سمتھ (Smith) نے بھی اس تصور کی حمایت کی، جبکہ بیسویں صدی کے مفکرین میزس (Mises) اور ہائیک (Hayek) نے بھی اسے اہمیت دی (Van de Haar 2009, 2011) ۔

طاقت کے توازن کا تصور کم از کم قدیم زمانے سے موجود ہے۔ اس کا بنیادی خیال نسبتاً سادہ ہے: ریاستیں اس بات میں دلچسپی رکھتی ہیں کہ کسی ایک بڑی طاقت کو غالب آنے سے روکا جائے، کیونکہ ایک غالب طاقت بغیر کسی مؤثر مزاحمت کے اپنے جارحانہ عزائم کو عملی جامہ پہنانے کے قابل ہو

سکتی ہے۔ چنانچہ دیگر ریاستیں غالب ریاست، یا ریاستوں کے کسی اتحاد، کی طاقت کو متوازن کرنے کے لیے باہمی اتحاد (alliances) تشکیل دیتی ہیں۔

اس طرح ریاستیں ایک دوسرے کی طاقت کو متوازن رکھتی ہیں، جس کا نتیجہ بڑی جنگوں کی روک تھام کی صورت میں نکل سکتا ہے، کیونکہ طاقت کے نسبتاً متوازن نظام میں جنگ کی ممکنہ قیمت اور نقصانات تمام فریقین کے لیے بہت زیادہ ہو جاتے ہیں۔

لٹل (Little 2007) نشاندہی کرتے ہیں کہ طاقت کا توازن 'اشتراکی' (associational) نوعیت کا ہو سکتا ہے، جب اس کا انحصار بڑی طاقتوں کے رہنماؤں کے درمیان کسی مشترکہ نظریے یا باہمی مفاہمت پر ہو۔ اس کی ایک مثال جنگ کے اختتام پر امن معاہدے کے نتیجے میں قائم ہونے والا نظام ہے، جیسا کہ 1815 کے بعد 'کنسرٹ آف یورپ' (Concert of Europe) کے قیام کی صورت میں سامنے آیا۔ اس کے برعکس، 'مخالفانہ' (adversarial) توازن اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس کا مقصد کسی دوسری ریاست اور اس کے اتحادیوں کی موجودہ یا ابھرتی ہوئی طاقت کو روکنا یا محدود کرنا ہو۔ اس کی نمایاں ترین مثال 'سرد جنگ (Cold War)' ہے، جو 1945 سے 1990 تک جاری رہی اور جس میں ایک طرف امریکہ کی حمایت یافتہ 'آزاد دنیا' اور دوسری طرف سوویت یونین کی قیادت میں کمیونسٹ دنیا موجود تھی۔

اپنے پورے علمی و فکری سفر کے دوران، ہائیک (Hayek) نے 'خودکار نظم' (spontaneous order) کے تصور پر لکھا۔ اس سے مراد ایسا نظم ہے جو افراد یا افراد کے گروہوں کی جانب سے اپنے ذاتی مقاصد کے حصول کی کوششوں کے غیر ارادی نتیجے کے طور پر وجود میں آتا ہے۔ خودکار نظام وقت کے ساتھ ارتقا پذیر ہوتے ہیں اور اپنے مختلف اجزا کے درمیان ایک خاص توازن پیدا کرتے ہیں۔ بین الاقوامی امور میں 'طاقت کا توازن' ہائیک کے بیان کردہ خودکار نظم کی ایک نمایاں مثال ہے۔

کچھ ریاستیں، خواہ تنہا یا اتحادوں کی صورت میں، دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں؛ لیکن اس کوشش میں انہیں ایسی دوسری ریاستوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن کے اپنے مفادات اور اہداف بھی موجود ہوتے ہیں۔ نتیجتاً، ریاستوں کے مابین طاقت کا ایسا نسبتاً متوازن نظام وجود میں آ سکتا ہے جو بین الاقوامی نظم اور استحکام میں معاون ہو (Van de Haar 2011)۔
اس کے باوجود، یہ توازن کبھی مکمل نہیں ہوتا، کیونکہ یہ اکثر کمزور اور شاذ و نادر ہی مستقل ہوتا ہے۔ ریاستیں اپنے اتحاد تبدیل کر سکتی ہیں، ان کی طاقت میں اضافہ یا کمی واقع ہو سکتی ہے، بڑی طاقتوں کے اثر و رسوخ میں اتار چڑھاؤ آ سکتا ہے، اور اتحادی ریاستوں یا ان کے آلہ کاروں (proxies) کے درمیان تنازعات بھی جنم لے سکتے ہیں۔ سرد جنگ کے دوران ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں متعدد 'گرم جنگیں (hot wars)' اور مسلح تنازعات اسی حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں۔
تاہم، مجموعی طور پر طاقت کا توازن کسی ایک طاقت کو دوسری طاقتوں پر مکمل غلبہ حاصل کرنے سے روکنے میں مدد دیتا ہے اور یوں بین الاقوامی نظم و ضبط کو برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ یوکرین کے خلاف روسی جارحیت کے جواب میں مغربی ممالک کی جانب سے فراہم کی جانے والی عسکری امداد اس کی ایک حالیہ مثال ہے۔ کلاسیکی لبرلز (Classical liberals) ایسی صورتِ حال کو بین الاقوامی سطح پر 'خودکار نظم (spontaneous order)' کی ایک مثال کے طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

جنگ

جنگ انسانی تجربے کے تباہ کن ترین واقعات میں سے ایک اور انفرادی آزادی کے لیے سنگین ترین خطرات میں سے ایک ہے۔ اس کے بے شمار نقصانات ہیں، جن میں انسانی جانوں کا ضیاع، انسانی

حقوق کی خلاف ورزیاں، مادی اور ماحولیاتی تباہی، گھروں کی بربادی اور معاشی اخراجات شامل ہیں۔ یہ حقیقت آج بھی اتنی ہی درست ہے جتنی کہ سینکڑوں سال پہلے تھی۔

کلاسیکی لبرلز (Classical liberals) اس معاملے کو معمولی نہیں سمجھتے اور نہ ہی جنگ کے بارے میں محض تجریدی یا نظریاتی گفتگو کرتے ہیں۔ تاہم، وہ جنگ کے کبھی کبھار رونما ہونے کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔ اس کی وجوہ میں انسانی فطرت، بعض اوقات طاقت کا توازن برقرار رکھنے کی کوششیں، اور دیگر عوامل شامل ہو سکتے ہیں، مثلاً مذہب، جغرافیہ، خام مال اور قدرتی وسائل، یا کسی مخصوص ملک میں اچانک پیدا ہونے والی آمریت وغیرہ۔

لہٰذا، کلاسیکی لبرل نقطۂ نظر میں بنیادی سوال یہ نہیں ہے کہ ''ہم جنگ سے ہمیشہ کے لیے کیسے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں؟''—جیسا کہ بعض دیگر لبرل مفکرین سوال اٹھاتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ ''ہم جنگ کے ناگزیر وقوع پذیر ہونے سے کیسے نمٹ سکتے ہیں اور اسے ممکنہ حد تک کیسے محدود کر سکتے ہیں؟''

اس کا مقصد ہر گز یہ نہیں کہ سب کچھ تقدیر کے حوالے کر دیا جائے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح، کلاسیکی لبرلز (classical liberals) بھی حتی الامکان جنگ سے گریز کو ترجیح دیتے ہیں۔

انہوں نے کبھی جنگ کو 'میکیاولیائی (Machiavellian)' طرزِ سیاست کے ایک معمول کے آلے کے طور پر نہیں دیکھا، بلکہ ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ اگر جنگ ناگزیر ہو تو اس کے لیے کوئی جائز وجہ موجود ہونی چاہیے اور جنگ لڑنے کے طریقوں کو بھی ضابطۂ اخلاق کا پابند ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں دانش مندی، معقولیت اور احتیاط وہ بنیادی اوصاف ہیں جن پر کلاسیکی لبرل مفکرین نے زور دیا ہے۔ چنانچہ یہ حیرت کی بات نہیں کہ بین الاقوامی قانون میں 'جائز جنگ (just war)' کے تصور اور کلاسیکی لبرل فکرِ جنگ کے درمیان گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر، ہیوم (Hume) اور سمتھ (Smith) جیسے مفکرین نے بین الاقوامی قانون کے عظیم ماہرین — جیسے سواریز(Suarez)، ڈی ویٹل (de Vattel) اور بالخصوص گروشیئس(Grotius) کے کام کو بہت اہمیت دی۔

'جائز جنگ' کی روایت کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ جنگ کے آغاز کے لیے کوئی جائز وجہ موجود ہو، اگرچہ اس روایت میں جائز وجوہات کی فہرست کافی وسیع ہے۔ ان میں اہم وجوہات یہ ہیں: بیرونی حملے یا ریاست کی خود مختاری اور علاقائی سالمیت کی خلاف ورزی کی صورت میں اپنے دفاع کا حق؛ کسی دوسری ریاست کے ہاتھوں اپنے شہریوں کا قتل؛ شہریوں کو یرغمال بنانا؛ قرضوں کی عدم ادائیگی؛ یا امن معاہدوں کی خلاف ورزی۔

'جائز جنگ' کی روایت کا دوسرا بنیادی معیار یہ ہے کہ جنگ منصفانہ طریقے سے لڑی جائے۔ اس کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ جنگی کارروائیوں کے دوران بے گناہ غیر جنگجو افراد، یعنی عام شہریوں، کو حتی الامکان تحفظ فراہم کیا جائے۔ اسی طرح، اگر کسی علاقے پر قبضہ یا فتح حاصل کر لی جائے تو، اگرچہ وہاں کے حکمرانوں کو تبدیل کیا جا سکتا ہے، لیکن مقامی آبادی کو اپنی زندگی، مذہب اور روزمرہ معمولات حتی الامکان جاری رکھنے کی اجازت دی جانی چاہیے۔

رینگر (Rengger 2013) نے اس بات پر زور دیا کہ یہ سوچنا ایک خام خیالی ہے کہ 'جائز جنگ (just war)' کی روایت تنازعات کو حل کر سکتی ہے یا جنگ کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ اس روایت کو جنگ پر ایک اخلاقی قدغن یا پابندی کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، جو ان طاقتوں کی جانب سے لڑی جانے والی لامحدود جنگ کے مقابلے میں ایک بہتر متبادل ہے جو جنگ کی اخلاقی بنیادوں کی بہت کم یا کوئی پروا نہیں کرتیں۔

تاہم، 'جائز جنگ' کی روایت کو اکثر جنگ شروع کرنے اور اسے لڑنے کے طریقۂ کار کے جواز کے طور پر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ وقت کے ساتھ 'جائز جنگ' کا تصور ایسی شکل اختیار کر گیا ہے جس میں طاقت کے استعمال کو محدود کرنے کے بجائے سیاسی اختیار کے ذریعے انصاف کے قیام پر زیادہ

توجہ دی جاتی ہے۔ اس لیے یہ حیرت کی بات نہیں کہ، خصوصاً دوسری جنگِ عظیم کے بعد، جنگوں کو تیزی سے کسی جائز مقصد کے لیے لڑی جانے والی جنگوں کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ اس کے برعکس، 'جائز جنگ' کی روایت کے دیگر اصول، جو تشدد کے استعمال کو محدود کرنے سے متعلق ہیں، اسی درجے میں نہیں اپنائے گئے۔

مجموعی طور پر، 'جائز جنگ' کی روایت ضبطِ نفس اور احتیاط پر زور دیتی ہے۔ کلاسیکی لبرلز (classical liberals) ضبطِ نفس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن ان کے نزدیک اس کا مطلب لازماً امن پسندی (pacifism) اختیار کرنا نہیں ہے۔ انسانی فطرت اور بین الاقوامی معاملات کے بارے میں کلاسیکی لبرل نقطۂ نظر کو مدنظر رکھتے ہوئے، امن پسندی کو اکثر ایک غیر حقیقت پسندانہ یا نامناسب ردعمل سمجھا جاتا ہے۔ بعض اوقات مستقبل میں بڑے مسائل سے بچنے کے لیے جنگ ناگزیر ہو سکتی ہے؛ مثلاً کسی آمر حکمران کو مزید ممالک پر قبضہ کرنے سے روکنے کے لیے۔

وسیع تر لبرل روایت میں جنگ کے بارے میں زیادہ تر بحث عموماً دو یا اس سے زیادہ ریاستوں کے درمیان ہونے والی جنگوں تک محدود رہی ہے۔ تاہم، جنگ کی کئی دوسری صورتیں بھی موجود ہیں، مثلاً گوریلا جنگ، ایسے تنازعات جن میں ریاستوں کے آلہ کار (proxies) لڑتے ہیں، یا ایسے پیچیدہ تنازعات جن میں مسلح گروہ، ریاستیں اور ریاستی سرپرستی یافتہ مسلح گروہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِپیکار ہوں۔ شام اور عراق میں حالیہ جنگیں اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

درحقیقت، جدید دنیا میں روایتی بین الریاستی جنگوں کے مقابلے میں اس نوعیت کے پیچیدہ تنازعات زیادہ عام ہوتے جا رہے ہیں۔ علمی مطالعے اور عملی سیاست، دونوں کے اعتبار سے، یہ امتیازات اہم ہیں۔ کلاسیکی لبرلز کے نزدیک، ایسے تنازعات بنیادی طور پر اس حقیقت کی ایک اور مثال ہیں کہ جنگ انسانی معاشروں میں مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی؛ تاہم، ان سے نمٹنا روایتی بین الریاستی جنگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ ہو سکتا ہے۔

جنگ کی قیمت

کلاسیکی لبرل اور لبرٹیرین (libertarian) روایات میں 'جنگ کی پوشیدہ قیمتوں' (hidden costs of war) کے حوالے سے ایک اہم علمی ذخیرہ موجود ہے۔اس سے مراد وہ قوانین اور ضوابط ہیں جو اکثر غیر لبرل نوعیت کے ہوتے ہیں جنہیں ریاست جنگ کے خطرات سے نمٹنے اور فتح کے امکانات بڑھانے کے لیے نافذ کرتی ہے۔ان میں اظہارِ رائے یا آزادانہ انجمن سازی (free association) پر پابندیاں بھی شامل ہو سکتی ہیں۔

اس موضوع پر ہونے والی بیشتر علمی بحث جنگ کے معاشی اثرات پر مرکوز رہی ہے؛ مثلاً ایسے اقدامات جن کے ذریعے ریاست جنگی کوششوں کے لیے معیشت کے بڑے حصوں کو قومی تحویل میں لے لیتی ہے۔ہائیک (Hayek) اور میزس (Mises) نے ایسی جنگی معیشت پر سخت تنقید کی اور استدلال کیا کہ جنگ کے دوران بھی آزاد منڈی (free market) ہی جدید اور مؤثر پیداواری اداروں کو فروغ دینے کے لیے زیادہ موزوں رہتی ہے۔

ہگز (Higgs 2005) نے خبردار کیا کہ جنگ کے دوران نافذ کیے جانے والے یہ غیر معمولی اقدامات جنگ کے خاتمے کے بعد کبھی بھی مکمل طور پر واپس نہیں لیے جاتے۔اس طرح جنگیں ریاست کے دائرۂ اختیار اور طاقت میں مستقل توسیع کا باعث بن سکتی ہیں۔اسی نتیجے کی بنیاد پر ہگز جنگ کے مکمل خاتمے کی حمایت کرتے ہیں۔

کلاسیکی لبرلز اس تجزیے سے بڑی حد تک اتفاق کرتے ہیں، لیکن ان کے نزدیک جنگ کے خاتمے کو اس بنیاد پر ایک عملی حل سمجھنا غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ان کے نزدیک جنگ کو مکمل طور پر ختم کرنا ممکن نہیں۔جنگ کے بعد محدود یا سلب شدہ آزادیوں کی بحالی یقیناً اہم ہے، لیکن یہ بنیادی طور پر ملکی سیاست کا مسئلہ ہے۔

چنانچہ صرف اس بنیاد پر کہ جنگ ریاستی طاقت کو وسعت دیتی ہے، جنگ کے مکمل خاتمے کا مطالبہ کرنا جیسا کہ بعض مفکرین کرتے ہیں بظاہر ہمدردانہ اور اصولی معلوم ہو سکتا ہے، لیکن کلاسیکی لبرل نقطۂ نظر سے یہ ایک غیر حقیقت پسندانہ مطالبہ بھی ہے۔

عسکری مداخلت

کلاسیکی لبرلز (classical liberals) اور 'جائز جنگ (just war) ' کے نظریے کے حامیوں کے لیے ایک اہم سوال یہ ہے کہ ان حکمرانوں کے خلاف انسانی بنیادوں پر عسکری مداخلت کس حد تک جائز ہے جو اپنی ہی عوام پر ظلم و ستم ڈھاتے ہیں۔ اس مسئلے کو عموماً یوں بیان کیا جاتا ہے: کیا 'ریاست الف' کو 'ریاست ب' کے معاملات میں مداخلت یا وہاں فوجی کارروائی کرنی چاہیے، تاکہ اس سنگین زیادتی کا تدارک کیا جا سکے جو 'ریاست ب' کے حکمران اپنی ہی آبادی کے خلاف کر رہے ہیں، مثلاً انسانی حقوق کی شدید خلاف ورزیاں؟

سرد جنگ کے خاتمے اور اس دور میں موجود طاقت کے توازن کے نظام کے اختتام کے بعد ایسی مداخلتیں زیادہ عام ہو گئی ہیں۔ اقوامِ متحدہ اس تصور کو 'تحفظ کی ذمہ داری' (Responsibility to Protect)، یا مختصراً R2P، کے اصول کے تحت بیان کرتی ہے (United Nations 2021) ۔ R2P کا تصور ان حکومتوں کے خلاف بیرونی مداخلت کو جائز قرار دینے کے لیے استعمال کیا گیا ہے جن پر اپنی ہی عوام کے خلاف سنگین انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا ارتکاب کرنے کا الزام ہو۔

یوں ایسی مداخلتوں کو اب محض ریاستوں کے باہمی تعلقات تک محدود واقعات کے طور پر نہیں دیکھا جاتا، بلکہ انہیں عالمی نظام اور بین الاقوامی نظم پر اثر انداز ہونے والے اہم واقعات کے طور پر سمجھا جاتا

ہے جو سرد جنگ کے دور کے مقابلے میں بین الاقوامی سیاست کی ایک نمایاں تبدیلی کی عکاسی کرتے ہیں۔

یہ سوال کہ آیا کسی ریاست یا ریاستوں کے اتحاد کو کسی مصیبت زدہ آبادی کی خاطر مداخلت کی اجازت ہونی چاہیے، متعدد مسائل کو جنم دیتا ہے، جن میں اہم اخلاقی سوالات بھی شامل ہیں۔

چونکہ کلاسیکی لبرلز (classical liberals) انفرادی انسانی حقوق کے تحفظ پر یقین رکھتے ہیں، تو کیا انہیں یہ بھی نہیں ماننا چاہیے کہ غیر ملکی شہریوں جو خود بھی انسان ہیں اور انہی بنیادی حقوق کے حامل ہیں، کی خاطر مداخلت کرنا ایک حق، یا شاید ایک اخلاقی فریضہ بھی ہو سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہم ہیوم (Hume) اور سمتھ (Smith) کے خیالات کا جائزہ لے سکتے ہیں(Van de Haar 2013b) ۔دونوں مفکرین نے ہمدردی (sympathy)کو انسانی تعلقات کی تشکیل اور ان کے اخلاقی جائزے کے لیے ایک مرکزی محرک اور ذریعہ سمجھا۔ عسکری مداخلت کا جواز بھی ہمدردی اور انصاف، اور انسانی تعلقات پر ان کے اطلاق، سے مربوط کیا جا سکتا ہے۔ اگر تعلقات مضبوط ہوں، یعنی ان میں ہمدردی کا عنصر زیادہ ہو، تو مداخلت زیادہ فوری اور ممکنہ طور پر انصاف کے تقاضوں کے مطابق بھی سمجھی جا سکتی ہے۔

سمتھ نے ہمدردی کی تعریف اس طور پر کی کہ انسان میں فطری طور پر یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کے جذبات یا کیفیات کے ساتھ کسی حد تک ہم آہنگی محسوس کرے۔ دوسرے لفظوں میں، یہ خود کو دوسرے شخص کی جگہ رکھ کر اس کے احساسات کو سمجھنے کی صلاحیت ہے۔

یہ صلاحیت کسی مخصوص رویے، اور اس سے وابستہ جذبات مثلاً محبت، غم، خیر خواہی اور فخر کی مناسبت کے بارے میں فیصلہ کرنے کا باعث بنتی ہے۔ سمتھ نے اسی تصور کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک فرضی 'غیر جانب دار تماشائی (impartial spectator) 'کا تصور پیش کیا، جو انسان کے اپنے رویے کا جائزہ لینے کے لیے ایک اخلاقی جج یا معیار کا کردار ادا کرتا ہے۔

ہیوم ہمدردی کو 'ابلاغ کے اصول (principle of communication) ' کے طور پر دیکھتے تھے، جو انسان کو دوسروں کے رجحانات اور خواہشات سے آگاہ کرتا ہے۔ تاہم، ہیوم نے ہمدردی کی مخصوص اور عمومی اقسام میں بھی فرق کیا۔ مخصوص ہمدردی کا تعلق خاص افراد سے ہوتا ہے، جبکہ عمومی ہمدردی مشترکہ انسانیت کے ایک وسیع تر احساس پر مبنی ہوتی ہے۔

ہیوم کے نزدیک یہ عمومی احساس بذاتِ خود عملی اقدام کے لیے کافی محرک فراہم نہیں کرتا تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، انسانوں کے درمیان کوئی عالمگیر اخوت (universal brotherhood) موجود نہیں تھی، اور اس لیے محض اس تصور کی بنیاد پر کسی عملی فریضے کا وجود بھی ضروری نہیں تھا۔ مخصوص ہمدردی بنیادی طور پر قریبی تعلقات سے پیدا ہوتی ہے، اور جب فرد اور اس کے بنیادی گروہوں کے درمیان جغرافیائی یا سماجی فاصلہ بڑھتا ہے تو ہمدردی کی شدت بھی کم ہو جاتی ہے۔

سرحد کے اُس پار موجود لوگوں کے لیے ہمدردی کا احساس مکمل طور پر ختم نہیں ہوتا، لیکن اس کی شدت یقیناً کم ہو جاتی ہے اور وہ شاذ و نادر ہی کسی عملی اقدام کا محرک بنتا ہے۔ دور دراز علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی بدحالی پر عارضی طور پر دکھ یا ہمدردی کا احساس پیدا ہونا ممکن ہے، لیکن زیادہ تر لوگوں کے لیے یہ جذبات عموماً ثانوی یا سطحی نوعیت کے ہوتے ہیں۔

چنانچہ ہیوم اور سمتھ کے اس نقطۂ نظر سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ غیر ملکی آبادی کی مدد کے لیے عسکری مداخلت کا کوئی عمومی اخلاقی فریضہ موجود نہیں تھا۔ انسانی ہمدردی موجود ہو سکتی ہے، لیکن محض اس ہمدردی کی بنیاد پر کسی ریاست پر دوسرے ملک میں فوجی مداخلت کی لازمی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

اگرچہ مداخلت کی کوئی لازمی ذمہ داری موجود نہیں تھی، تاہم ہیوم (Hume) اور سمتھ (Smith) دونوں مداخلت کے کسی ممکنہ حق کے بارے میں مکمل طور پر غیر واضح بھی نہیں تھے۔ وہ انصاف کو زیادہ تر ایک 'منفی اصول (negative principle) ' کے طور پر دیکھتے تھے،

جس کا بنیادی تقاضا یہ تھا کہ انسان دوسروں کے ساتھ کچھ ایسے کام نہ کرے جو ان کے حقوق کی خلاف ورزی ہوں۔ ہیوم کا مزید استدلال تھا کہ بین الاقوامی معاملات میں انصاف کے اصولوں کی پابندی کی فطری ذمہ داری، ملکی معاملات کی نسبت کم سخت ہوتی ہے۔

دوسری جانب، ہیوم نے گروشین (Grotian) بین الاقوامی قانون کی حمایت بھی کی اور اس بات کو تسلیم کیا کہ بین الاقوامی نظام کے قیام اور اسے برقرار رکھنے کے لیے مشترکہ بین الاقوامی اصول مفید اور ضروری ہیں۔ اس نظام میں خود مختاری (sovereignty) کو بنیادی اہمیت حاصل تھی اور 'عدمِ مداخلت (non-interventionism) ' اس کا ایک بنیادی اصول تھا۔

اس کے باوجود، حکمرانوں کے لیے یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ وہ بین الاقوامی تعلقات میں انصاف کے بنیادی اصولوں کا احترام کریں، خواہ ان اصولوں سے وابستہ ذمہ داریاں ملکی معاملات کے مقابلے میں نسبتاً کمزور ہی کیوں نہ ہوں۔ گروشس (Grotius) نے 'اصلاحی انصاف ' (corrective justice) کے لیے کچھ گنجائش ضرور رکھی تھی اگرچہ اسے کبھی ایک لازمی فریضہ قرار نہیں دیا اور یہ اصول اس وقت لاگو ہو سکتا تھا جب کوئی ظالم حکمران اپنی رعایا پر سنگین مظالم ڈھائے۔ تاہم، اس کا بنیادی مقصد مظلوم آبادی کا تحفظ نہیں بلکہ ظالم حکمران کو سزا دینا تھا۔

اگرچہ اس تصور سے مداخلت کے لیے کچھ اخلاقی یا قانونی جواز ضرور پیدا ہوتا تھا، لیکن اس سے مداخلت کا کوئی باقاعدہ 'حق' وجود میں نہیں آتا تھا۔ بالخصوص، اس کا موازنہ ان باکردار اور دوراندیش حکمرانوں کے تصور سے نہیں کیا جا سکتا جن سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر سماجی نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کے لیے ذمہ داری سے کام کریں گے۔

مختصراً، مداخلت کے حق میں کوئی مضبوط اور واضح 'کلاسیکی لبرل' اصول موجود نہیں ہے، اگرچہ کسی حکمران کی جانب سے اپنی رعایا کے ساتھ شدید بدسلوکی کی صورت میں مداخلت کے لیے کچھ گنجائش ضرور پیدا ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ سمتھ اور ہیوم دونوں نے تسلیم کیا، یہ گنجائش ریاستی رہنماؤں

کو حالات کے مطابق عمل کرنے اور اپنی حکمتِ عملی طے کرنے کے لیے کچھ 'گنجائشِ عمل' (room for manoeuvre)فراہم کرتی ہے۔

یہ اصول بین الاقوامی قانون میں موجودہ صورتحال سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ خودمختاری (sovereignty)آج بھی عالمی نظام کاایک بنیادی اصول ہے، جس کے تحت زیادہ تر عسکری یا انسانی بنیادوں پر کی جانے والی مداخلت کو ناجائز یا غیر منصفانہ تصور کیا جاتا ہے۔

البتہ ہمارے عہد اور اسکاٹش روشن خیالی (Scottish Enlightenment) کے مفکرین کے دور میں ایک اہم فرق ضرور ہے: اقوامِ متحدہ نے 'تحفظ کی ذمہ داری' (Responsibility to Protect)یا (R2P کے اصول کے ذریعے مخصوص حالات میں انسانی بنیادوں پر عسکری مداخلت کے لیے ایک محدود گنجائش تسلیم کی ہے۔اس کے باوجود، کسی خودمختار ریاست کے داخلی معاملات میں بیرونی مداخلت آج بھی ایک استثنائی اقدام ہی سمجھی جاتی ہے۔

زیادہ تر کلاسیکی لبرلز (classical liberals) اس بنیادی تصور سے متفق ہیں۔ دیگر بعض لبرل نقطہ ہائے نظر کے برعکس، وہ لازماً مزید عسکری یا انسانی بنیادوں پر مداخلت کی حمایت نہیں کرتے، بلکہ خودمختاری، عدمِ مداخلت اور بین الاقوامی نظم کے درمیان محتاط توازن کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

فوجی مداخلت کے اثرات

اگر کوئی شخص فوجی مداخلت کے اصولی جواز کا قائل بھی ہو، تب بھی ایک بنیادی سوال باقی رہتا ہے : کیا فوجی مداخلت واقعی مؤثر ثابت ہوتی ہے؟ مداخلت کا عسکری مرحلہ شاید کامیاب ہو جائے مثلاً 'بری' حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے لیکن اس کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال بھی اتنی ہی اہم

ہوتی ہے۔ سیاست دانوں، عسکری منصوبہ سازوں اور دیگر متعلقہ فریقین کو نہ صرف مداخلت کے بعد کے حالات بلکہ 'انخلا کی حکمتِ عملی(exit strategy) '، یعنی کب اور کس طریقے سے وہاں سے نکلنا ہے، کے بارے میں بھی غور کرنا پڑتا ہے۔

عراق، افغانستان، لیبیا اور مالی میں گزشتہ دو دہائیوں کے تجربات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیرونی مداخلت کے ذریعے لبرل جمہوریت قائم کرنے کی کوششیں بڑی حد تک ناکام رہی ہیں۔ بھرپور کوششوں کے باوجود کسی ملک میں لبرل جمہوری سیاسی ثقافت کو 'بنے بنائے نظام (off-the-shelf system) ' کی طرح درآمد کرنا انتہائی مشکل ثابت ہوا ہے۔ حتیٰ کہ نسبتاً محدود پیمانے کی مداخلتوں کے نتیجے میں بھی اقوامِ متحدہ کی امن فوج کو بعض ممالک میں کئی دہائیوں تک موجود رہنا پڑا ہے، جیسا کہ قبرص کی مثال سے واضح ہوتا ہے۔

ایسے واقعات بھی پیش آئے ہیں جہاں مختلف سیاسی اور فکری نقطہ ہائے نظر رکھنے والے بہت سے افراد اس بات پر متفق تھے کہ مداخلت ضروری تھی۔ اس کی شاید سب سے واضح مثال 1994 میں روانڈا کی نسل کشی ہے، جب بڑی طاقتوں نے مداخلت نہیں کی اور وہاں موجود اقوامِ متحدہ کی ایسی فورس پر انحصار کیا گیا جو اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے مناسب طور پر مسلح نہیں تھی۔

اس کے باوجود، 'کچھ نہ کچھ ضرور کیا جائے' کا دباؤ ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ تاہم، کلاسیکی لبرلز (classical liberals) اکثر ایسے مطالبات کی مخالفت کرتے ہیں جو فوری کارروائی پر زور دیتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک کسی مداخلت کے اخلاقی جواز سے زیادہ اہم یہ سوال بھی ہے کہ اس کے عملی نتائج کیا ہوں گے اور کیا مداخلت واقعی اس مسئلے کو حل کرنے کے قابل ہے جس کے لیے اسے شروع کیا گیا تھا۔

ہیوم (Hume) نے لکھا تھا کہ ہر حکومت کا انحصار 'رائے (opinion) ' پر ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک اس کا مطلب یہ تھا کہ حکمران بالآخر عوام کی رضامندی پر منحصر ہوتے ہیں اور عوام میں کسی بھی حکومت کو ختم کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ عملی طور پر ایسا ہونے میں طویل وقت

لگ سکتا ہے بعض ممالک میں تو صدیوں بھی گزر سکتی ہیں لیکن تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں انقلاب کا امکان ایک حقیقی حقیقت ہے۔

فریڈمین (Friedman 1962) نے نشاندہی کی کہ انفرادی آزادی اور معاشی آزادی ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتی ہیں اور ایک 'آزاد معاشرے' میں ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ایسے ممالک جہاں معاشی آزادی تو موجود ہو لیکن سیاسی آزادی محدود ہو، وہاں عوام بالآخر مزید سیاسی حقوق اور آزادیوں کا مطالبہ کریں گے۔ اگرچہ اس عمل میں طویل وقت لگ سکتا ہے اور بعض صورتوں میں انقلاب بھی درکار ہو سکتا ہے، لیکن اس دوران عوام کو شدید مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

یہ دلیل اس بات کی حمایت میں پیش نہیں کی جارہی کہ ہر حال میں کچھ نہ کیا جائے۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ بعض کلاسیکی لبرلز (classical liberals) فوجی مداخلت کو ایک ایسا حل سمجھتے ہیں جو تمام متعلقہ فریقین کے لیے زیادہ نقصان دہ یا غیر متوقع نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

دنیا ایک تلخ اور ہنگامہ خیز جگہ ہو سکتی ہے، اور کسی حد تک مستحکم بین الاقوامی نظام کا قیام بذاتِ خود ایک بڑی کامیابی ہے۔ طاقت کا توازن بڑی جنگوں اور تنازعات کو روکنے میں مدد دے سکتا ہے، اگرچہ وہ ہمیشہ ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ بعض حالات میں مداخلت ناگزیر بھی ہو سکتی ہے، لیکن اس سے عالمی سیاست کو منظم کرنے والے بنیادی اصول لازماً تبدیل نہیں ہو جاتے۔

کلاسیکی لبرلز اس بنیادی حقیقت سے نمٹنے کی کوشش کرتے ہیں کہ تنازعات سے پاک اور مکمل طور پر ہم آہنگ دنیا یقیناً ایک قابلِ ستائش مقصد ہے، لیکن اسے ایک عملی حقیقت سمجھنا محض ایک خوش فہمی یا خیالی تصور ہی رہے گا۔

آٹھواں باب

اصول: بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی تنظیمیں

کیا بین الاقوامی تعلقات میں اصول وضوابط کے لیے کوئی گنجائش موجود ہے؟ اور اگر ہے، تو یہ اصول کون سے ہیں؟ کلاسیکی لبرلز (classical liberals) اس تصور کے قائل نہیں کہ بین الاقوامی تعلقات کی بنیادی خصوصیت صرف تشدد اور طاقت کا استعمال ہے۔ درحقیقت، بین الاقوامی سطح پر اصول و ضوابط کے لیے خاصی گنجائش موجود ہے، اگرچہ بین الاقوامی قانون کو اکثر 'نرم قانون (soft law) ' جبکہ ملکی قانون کو 'سخت قانون (hard law) ' کہا جاتا ہے۔ اس فرق کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بین الاقوامی قانونی فیصلوں پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے کوئی ایسی بالادست اتھارٹی موجود نہیں جو ملکی سطح پر ریاستی اداروں کی طرح مؤثر نفاذ کر سکے۔

تمام تنازعات یا مسائل لازماً تشدد کا باعث نہیں بنتے۔ ان میں سے زیادہ تر کو ریاستوں کے مابین باہمی معاہدوں اور سمجھوتوں کے ذریعے حل کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، کوئی باقاعدہ معاہدہ یا بین الاقوامی اصولوں کا ایسا مجموعہ تشکیل دیا جا سکتا ہے جسے تمام متعلقہ فریق تسلیم کریں اور جس کا اطلاق ان سب پر یکساں ہو۔ بعض صورتوں میں بین الاقوامی سرکاری تنظیموں (International Governmental Organizations, IGOs) کا کردار اہم ہو سکتا ہے، جبکہ غیر

سرکاری تنظیمیں (Non-Governmental Organizations, NGOs) بھی بین الاقوامی تعاون اور اصولوں کے فروغ میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔

کلاسیکی لبرلز ایسے بین الاقوامی معاہدوں اور اصولوں کو اس وقت تک اہمیت دیتے ہیں جب تک وہ ایسے بین الاقوامی نظام کو برقرار رکھنے میں مددگار ثابت ہوں جو انفرادی آزادی کے تحفظ کے لیے ضروری ہے۔ اخلاقی ذمہ داری کے تقاضے کے تحت وعدوں، معاہدوں اور مشترکہ اصولوں کی پاسداری کی جانی چاہیے۔ تاہم، کلاسیکی لبرلز بین الاقوامی قوانین، اصولوں اور ضوابط کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد کے بارے میں بھی محتاط رہتے ہیں۔ بعض اوقات یہ اصول انفرادی آزادی کے تحفظ میں مدد دیتے ہیں، لیکن بعض حالات میں یہی قوانین اور ضوابط فرد کی آزادی کے لیے خطرہ بھی بن سکتے ہیں۔

بین الاقوامی قانون

معاہدے اور تجارتی معاہدات غالباً بین الاقوامی قانون کی قدیم ترین شکلوں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ ریاستوں کے درمیان مشترکہ مقاصد کے اظہار کا ذریعہ بنتے ہیں اور خودمختار ریاستوں پر مشتمل بین الاقوامی معاشرے کے لیے اصول و ضوابط (norms) وضع کرتے ہیں۔ یہ بین الاقوامی نظم کو برقرار رکھنے، تنازعات کے حل میں مدد دینے اور کسی حد تک بین الاقوامی سطح پر قانون کی حکمرانی کو فروغ دینے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ آج ہزاروں معاہدے اور بین الاقوامی قانون کی دیگر مختلف شکلیں موجود ہیں۔ ریاستیں اکثر بین الاقوامی قانون کی پاسداری اس لیے کرتی ہیں کہ وہ اسے اپنے بہترین مفاد میں سمجھتی ہیں یا اسے اخلاقی ذمہ داری تصور کرتی ہیں۔ اس طرح، بین الاقوامی قانون بین الاقوامی نظام کے قیام اور اس کے استحکام میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

تاہم، بین الاقوامی قانون میں اکثر ایسے مرکزی اختیار کا فقدان ہوتا ہے جو اس کے نفاذ کو یقینی بنا سکے۔ چنانچہ ریاستیں ہی بالآخر بین الاقوامی قانون کے نفاذ کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ بعض اوقات کسی معاہدے میں ہی تنازعات کے حل کا طریقہ کار شامل کر دیا جاتا ہے، یا یہ ذمہ داری کسی بین الاقوامی تنظیم، مثلاً عالمی تجارتی تنظیم (World Trade Organization, WTO)، کو سونپ دی جاتی ہے۔ بعض صورتوں میں ریاستیں پہلے ہی اس بات پر اتفاق کر لیتی ہیں کہ تنازعہ کس فورم پر حل کیا جائے گا، مثلاً کسی موجودہ عدالت یا ثالثی کے ادارے کے ذریعے۔

تاہم، بالآخر خصوصاً سنگین تنازعات کی صورت میں بین الاقوامی عدالتِ انصاف (International Court of Justice) جیسی اعلیٰ ترین بین الاقوامی عدالت بھی محدود یا بے اثر دکھائی دے سکتی ہے، کیونکہ اس کے فیصلوں پر عمل درآمد کے لیے اس کے پاس ملکی عدالتوں جیسا براہِ راست اختیار نہیں ہوتا۔ ایسی صورتِ حال میں دیگر ریاستیں مختلف اقدامات کر سکتی ہیں: وہ پیچھے ہٹ سکتی ہیں، احتجاج کر سکتی ہیں، اقتصادی یا دیگر پابندیاں عائد کر سکتی ہیں، اور انتہائی صورت میں جنگ کا راستہ بھی اختیار کر سکتی ہیں۔

کلاسیکی لبرلز (classical liberals) کے نزدیک، ایک اچھا بین الاقوامی قانونی نظام ایسے اصولوں پر مشتمل ہونا چاہیے جو ریاستوں کو ایک دوسرے کے ساتھ، اور ایک دوسرے کے شہریوں کے ساتھ، معاملات طے کرنے میں مدد دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، اسے موجودہ یا ممکنہ تنازعات کے حل کے ایسے طریقے بھی فراہم کرنے چاہییں جو کسی حد تک ان طریقوں سے مشابہ ہوں جن کے ذریعے ملکی سیاست میں تنازعات حل کیے جاتے ہیں۔

ریاستوں کے لیے یہ بات قرینِ عقل ہے کہ وہ متعدد بین الاقوامی معاملات میں باہمی تعاون کریں، مثلاً سفر، مواصلات، سرحدی تحفظ، تجارت، مالیاتی معاملات، انسانی اسمگلنگ کی روک تھام اور ماحولیاتی مسائل۔ ان میں قدرتی وسائل مثلاً مشترکہ یا بین الاقوامی پانیوں میں ماہی گیری کے وسائل کا تحفظ بھی شامل ہے۔

ایسے معاملات میں بین الاقوامی تعاون ریاستوں کو اپنے مشترکہ مفادات کے تحفظ، تنازعات کی روک تھام اور نسبتاً زیادہ منظم بین الاقوامی نظام کے قیام میں مدد دے سکتا ہے۔

تاہم، کلاسیکی لبرلز بین الاقوامی قانون کے بڑھتے ہوئے پھیلاؤ کے بارے میں بھی تشویش رکھتے ہیں۔ زیادہ تر مغربی قانونی نظاموں میں معاہدوں اور اسی نوعیت کی دیگر بین الاقوامی دستاویزات کو نسبتاً اعلیٰ قانونی حیثیت حاصل ہوتی ہے، جس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ قومی قانون پر فوقیت رکھتی ہیں۔ اس لیے حکومتوں کو بین الاقوامی مذاکرات کے دوران کیے جانے والے فیصلوں میں خاص احتیاط برتنی چاہیے، کیونکہ ان فیصلوں کے اثرات براہِ راست ان کے شہریوں کی زندگیوں پر مرتب ہو سکتے ہیں۔

بین الاقوامی سطح پر کسی معاہدے تک پہنچنا اگرچہ ایک پیچیدہ عمل ہو سکتا ہے، لیکن ایک بار معاہدہ طے پانے کے بعد اس میں ترمیم کرنا یا اسے ختم کرنا اکثر اس سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ میزس (Mises) اور ہائیک (Hayek) نے، خصوصاً دوسری جنگِ عظیم کے بعد، بین الاقوامی قانون کے اس بے تحاشا پھیلاؤ پر تنقید کی۔ ان کے نزدیک، نئے بین الاقوامی قوانین میں 'مثبت حقوق' اور مختلف مطالبات ــــ یعنی کسی چیز کو حاصل کرنے یا ریاست سے کسی خدمت کا تقاضا کرنے کے حقوق تیزی سے بڑھ رہے تھے، جبکہ کلاسیکی لبرلز بنیادی طور پر 'منفی حقوق' کو ترجیح دیتے ہیں، یعنی ایسے حقوق جو افراد کو دوسروں کی مداخلت یا نقصان سے تحفظ فراہم کرتے ہیں۔

ان کے نزدیک، بین الاقوامی سطح پر اس نوعیت کے نئے قوانین کا بڑھنا 'کنسٹرکٹو ازم' (constructivism) یا مصنوعی طور پر سماجی اور قانونی ڈھانچے تشکیل دینے کے رجحان کی ایک مثال تھا۔ اس کی ایک نمایاں مثال کونسل آف یورپ کا 'یورپی کنونشن برائے انسانی حقوق' (European Convention on Human Rights, ECHR) ہے، جس کے اثرات رکن ممالک کے قومی فوجداری قوانین اور دیگر ملکی قانونی و عدالتی انتظامات پر براہِ راست مرتب ہوتے ہیں۔

یہاں ضمنی طور پر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اگرچہ برطانیہ یورپی یونین (European Union, EU) سے علیحدہ ہو چکا ہے، لیکن اس نے ECHR سے علیحدگی اختیار نہیں کی، کیونکہ وہ اب بھی کونسل آف یورپ (Council of Europe) کا رکن ہے۔ کونسل آف یورپ اور یورپی یونین دو الگ الگ ادارے ہیں۔ برطانیہ یورپی یونین میں شامل ہونے سے 24 سال قبل ہی کونسل آف یورپ کا رکن بن چکا تھا (Equality and Human Rights Commission 2017)۔

لہٰذا، یورپی یونین سے برطانیہ کی علیحدگی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ یورپی انسانی حقوق کے نظام سے بھی الگ ہو گیا۔ یہ امتیاز اس بات کو سمجھنے کے لیے اہم ہے کہ بین الاقوامی تنظیمیں، بین الاقوامی معاہدے اور قومی قانونی نظام ایک دوسرے سے کس طرح منسلک ہوتے ہیں۔

بین الاقوامی سرکاری تنظیمیں (IGOs)

بین الاقوامی سرکاری تنظیمیں (International Governmental Organizations, IGOs) عام طور پر ریاستوں کے درمیان معاہدوں کے ذریعے قائم ہوتی ہیں، اس لیے بین الاقوامی معاہدوں سے متعلق مذکورہ بالا اصول ان تنظیموں پر بھی لاگو ہوتے ہیں۔ یہ صورتِ حال کلاسیکی لبرلز (classical liberals) کے لیے باعثِ تشویش ہے، کیونکہ بعض IGOs وقت کے ساتھ بین الاقوامی سطح پر ریاستی نوعیت کے ادارہ جاتی ڈھانچوں کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔

تاہم، یہاں بھی کوئی ایک ایسا جامع اور یکساں کلاسیکی لبرل اصول موجود نہیں جس کی بنیاد پر تمام IGOs کے بارے میں ایک ہی فیصلہ دیا جا سکے، کیونکہ یہ تنظیمیں اپنے مقاصد، اختیارات اور

ساخت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ چنانچہ بعض تنظیموں کی مخصوص سرگرمیوں یا اقدامات کو قابلِ قبول قرار دیا جا سکتا ہے، جبکہ دیگر اسی معیار پر پورا نہیں اترتیں۔

ایک عمومی اصول کے طور پر، وہ IGOs جو بین الاقوامی تعاون کے بنیادی طور پر تکنیکی اور عملی پہلوؤں سے متعلق ہوں، کلاسیکی لبرل نقطۂ نظر سے زیادہ معقول اور قابلِ فہم دکھائی دیتی ہیں۔ اگرچہ یہ بھی درست ہے کہ بظاہر تکنیکی معاملات پر بین الاقوامی اتفاقِ رائے پیدا کرنے کے عمل میں بعض اوقات سیاسی بحث و مباحثہ اور مفادات کا ٹکراؤ شامل ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس، بہت سی معروف اور بڑی IGOs کو کلاسیکی لبرلز کی جانب سے تنقید یا مخالفت کا سامنا رہا ہے۔ ان میں اقوامِ متحدہ کے بعض ادارے اور سرگرمیاں، عالمی بینک (World Bank) اور عالمی تجارتی تنظیم (World Trade Organization, WTO) شامل ہیں۔

لہٰذا، کلاسیکی لبرل نقطۂ نظر سے کسی بھی بین الاقوامی تنظیم کے بارے میں عمومی فیصلہ کرنے کے بجائے اس کے مخصوص اختیارات، سرگرمیوں، ادارہ جاتی ساخت اور انفرادی آزادی پر اس کے اثرات کا الگ الگ جائزہ لینا ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں، ہر IGO کے معاملے میں مخصوص کیس اسٹڈی اور تفصیلی تجزیہ درکار ہوتا ہے۔

دو عالمی جنگوں کے درمیانی عرصے میں ناکام ہونے والی 'لیگ آف نیشنز (League of Nations)' کے تجربے کی بنیاد پر، میزس (Mises) اور ہائیک (Hayek) اقوامِ متحدہ (United Nations, UN) کے نمایاں ناقدین میں شامل تھے (دیکھیے: Van de Haar 2009)۔ ان کے نزدیک اقوامِ متحدہ کا قیام ایک 'تعمیری (constructivist)' طرزِ فکر کا نتیجہ تھا اور یہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد مغربی ممالک اور سوویت بلاک کے درمیان ہونے والے ایک ناقص سمجھوتے کی نمائندگی کرتا تھا۔

انہیں خاص طور پر اس بات پر تشویش تھی کہ 'انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے (Universal Declaration of Human Rights)' میں بعض سماجی اور معاشی، یعنی 'مثبت حقوق (positive rights)' کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ مزید برآں، اقوامِ متحدہ کے ذیلی اداروں اور متعلقہ تنظیموں کے ایک وسیع نظام کے ذریعے ان حقوق کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی۔

تاہم، اس تنقید کو اقوامِ متحدہ کے تمام اداروں یا سرگرمیوں کی مکمل نفی کے طور پر نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ مثال کے طور پر، عالمی ادارۂ صحت (World Health Organization, WHO) ایک ایسے شعبے میں سرگرمِ عمل ہے جہاں ہائیک اور میزس بعض حالات میں حکومتی مداخلت کو جائز سمجھتے تھے۔ عالمی ادارۂ صحت کی بہت سی سرگرمیاں بنیادی طور پر تکنیکی نوعیت کی ہیں، جن میں معلومات کا تبادلہ، بیماریوں کی روک تھام اور وباؤں کا مقابلہ کرنا شامل ہے۔

بلاشبہ، عالمی ادارۂ صحت کے اندر اور اس کی کارکردگی کے بارے میں سیاسی بحث بھی ہوتی رہی ہے، خصوصاً کووڈ-19 کے حوالے سے اس کے ردِ عمل اور چینی حکومت کے ساتھ اس کے مبینہ قریبی تعلقات کے تناظر میں۔ اس بحث کا ایک پہلو یہ بھی رہا کہ چینی حکومت نے وائرس کے آغاز اور اس کے پھیلاؤ کے بارے میں مطلوبہ حد تک شفافیت کا مظاہرہ نہیں کیا۔

تاہم، اصولی طور پر عالمی ادارۂ صحت کا کردار عالمی وباؤں اور صحت سے متعلق دیگر بین الاقوامی مسائل کے لیے تیاری اور باہمی تعاون کو فروغ دینا ہونا چاہیے—خصوصاً ان حالات میں جہاں یہ کام نجی تنظیمیں، مثلاً ریڈ کراس (Red Cross)، مؤثر طور پر انجام نہ دے سکیں یا اسے انجام دینے کے لیے ان کے پاس مطلوبہ وسائل موجود نہ ہوں۔

اس طرح، کلاسیکی لبرل نقطۂ نظر میں کسی بین الاقوامی تنظیم کا جائزہ اس کے نام یا عمومی حیثیت کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اس کے مخصوص کردار، اختیارات اور سرگرمیوں کے انفرادی آزادی اور بین الاقوامی تعاون پر اثرات کی بنیاد پر لیا جانا چاہیے۔

تفصیلات میں جائے بغیر، کلاسیکی لبرلز اقوامِ متحدہ کے نظام کے اندر موجود بہت سی تنظیموں کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار رہتے ہیں، جن میں خود اقوامِ متحدہ کا مرکزی ڈھانچہ بھی شامل ہے۔ جنرل اسمبلی ریاستی نمائندوں کے لیے بین الاقوامی مسائل پر بات چیت کرنے کی ایک جگہ کے طور پر شاید کچھ افادیت رکھتی ہو۔ تاہم، سلامتی کونسل (اور خاص طور پر اس کے مستقل اراکین) کا موجودہ نظام واضح طور پر فرسودہ اور ماضی کے دور کی باقیات معلوم ہوتا ہے، کیونکہ یہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد قائم ہونے والی طاقت کے توازن کی عکاسی کرتا ہے (اگرچہ 1971 میں تائیوان کی جگہ چین کو شامل کر لیا گیا تھا)۔ یہ نظام ضروری نہیں کہ آج کی دنیا میں طاقت کے حقیقی توازن کی نمائندگی کرتا ہو، یا پھر یہ ایسے طاقت کے تعلقات کو فروغ دے سکتا ہے جو واضح طور پر فرسودہ ہو چکے ہیں۔ مزید برآں، اگر محتاط الفاظ میں کہا جائے تو، دنیا بھر میں تنازعات سے نمٹنے کے معاملے میں اقوامِ متحدہ کا کردار ہمیشہ قابلِ فخر نہیں رہا ہے۔

کلاسیکی لبرلز ایسی بین الحکومتی تنظیموں (IGOs) جیسے کہ انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن (ILO)، ورلڈ بینک اور ممکنہ طور پر انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (IMF) سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں، جو آزاد منڈیوں کے کام میں مداخلت کرتی ہیں۔ ڈبلیو ٹی او (WTO) پر بھی تنقید کی جاتی ہے، کیونکہ آزاد تجارت کے لیے ریاستی مداخلت کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی کہ اس کے لیے کسی بین الاقوامی تنظیم کا قیام ضروری سمجھا جائے؛ اگرچہ یہ بھی اہم ہے کہ کوئی ایسی بین الحکومتی تنظیم موجود ہو جس کا دائرۂ کار کھلی تجارت کو فروغ دینا ہو۔

اسی طرح، یورپی یونین (EU) کے حوالے سے بھی اس کے کچھ فوائد اور کچھ نقصانات ہیں، جس کی ایک وجہ اس کی مسلسل ارتقا پذیر نوعیت ہے۔ اس نے یورپ میں امن کے قیام اور استحکام میں اہم کردار ادا کیا ہے، اگرچہ اس امن کے فروغ میں سرد جنگ کے دوران طاقت کے توازن اور نیٹو (NATO) نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ یورپی یونین وفاق کے اس مثالی تصور سے بہت دور ہے جسے 'ہائیکین آئیڈیل (Hayekian ideal)' کہا جا سکتا ہے۔ یہ وفاقی سطح پر بعض اہم

اختیارات، مثلاً دفاع اور خارجہ پالیسی، کو یکجا نہیں کرتی، جبکہ اس کی بہت سی پالیسیاں——زرعی، معاشی، مالیاتی، ساختی اور علاقائی پالیسیاں وغیرہ——کلاسیکی لبرل نظریے میں کوئی واضح جگہ نہیں رکھتیں۔

دوسری طرف، اس کی 'اندرونی منڈی (internal market) '، اگرچہ اس کے بعض قواعدو ضوابط پر مزید غور وخوض کی ضرورت ہے، اور 'شینگن ایریا (Schengen Area) '، جہاں لوگوں کو آزادانہ نقل وحرکت حاصل ہے، کے بارے میں زیادہ مثبت رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ پناہ، امیگریشن اور سرحدی نگرانی کے لیے مشترکہ اصول بھی اصولی طور پر قابلِ قبول ہیں، اگرچہ عملی طور پر وہ غیر مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔

اگرچہ یورپی یونین کا ایک 'سپر سٹیٹ (superstate) ' بننے کی سمت میں سفر انفرادی آزادی کے لیے خطرات پیدا کر سکتا ہے، لیکن اس میں کچھ ایسی خصوصیات بھی موجود ہیں جو کلاسیکی لبرل اصولوں سے ہم آہنگ ہیں۔ دیگر بین الحکومتی تنظیموں (IGOs) کی تفصیلات میں جائے بغیر، یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان تنظیموں کو آزادی کے کلاسیکی لبرل اصولوں کی پاسداری کرنی چاہیے۔ بین الحکومتی تنظیمیں بذاتِ خود نہ اچھی ہوتی ہیں نہ بری۔ وہ مفید مقاصد کے حصول میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں، لیکن ساتھ ہی بین الاقوامی نظام اور/یا انفرادی آزادی کی راہ میں رکاوٹ بھی بن سکتی ہیں۔ لہٰذا، ان کا مسلسل تنقیدی جائزہ لیتے رہنا ضروری ہے۔

بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیمیں (INGOs)

حالیہ دہائیوں میں بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں (INGOs) کی سرگرمیوں اور ان کے بارے میں عمومی آگاہی میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اصولی طور پر کلاسیکی لبرلز کو ان تنظیموں پر کوئی اعتراض نہیں، کیونکہ یہ 'انجمن سازی کی آزادی (freedom of association) ' کا

ایک اظہار ہیں۔ اگرچہ کلاسیکی لبرلز INGOs کے بہت سے مقاصد سے اختلاف رکھتے ہیں— مثلاً وہ تنظیمیں جو تجارتی تحفظ پسندی (trade protectionism) یا ریاستی مداخلت میں اضافے کے لیے مہم چلاتی ہیں— لیکن ایسی بہت سی INGOs بھی موجود ہیں جو کلاسیکی لبرل پالیسیوں کی حمایت کرتی ہیں۔

کلاسیکی لبرلز حکومتوں کے اس عمومی طرزِ عمل پر اعتراض کرتے ہیں جس کے تحت وہ ٹیکس دہندگان کے پیسے سے غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کو مالی اعانت فراہم کرتی ہیں، اس توقع کے ساتھ کہ یہ تنظیمیں ایسے پالیسی اہداف حاصل کر سکتی ہیں جنہیں حکومتیں خود حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ جو NGOs حکومتوں سے ٹیکس دہندگان کا پیسہ وصول کرتی ہیں، انہیں حقیقی معنوں میں 'غیر سرکاری' کہنا مشکل ہو جاتا ہے؛ بلکہ ان پر یہ الزام عائد کیا جا سکتا ہے کہ وہ حکومت کا ایک توسیعی بازو بن چکی ہیں۔ یہ تعلق اس وقت اور بھی مشکوک ہو جاتا ہے جب INGOs انہی حکومتوں سے ٹیکس دہندگان کا پیسہ وصول کرنے کے بعد انہی حکومتوں کے سامنے اپنے مفادات یا پالیسی مقاصد کے لیے لابنگ (lobbying) بھی کرتی ہیں۔

یہ اس بات کی ایک واضح مثال ہے کہ پالیسی کے نتائج اکثر کسی غیر جانب دار حکومت کی جانب سے عوامی مفاد میں کیے گئے فیصلوں کے بجائے مفاداتی گروہوں کی لابنگ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ کلاسیکی لبرلز کے نزدیک، یہ ایک ایسی محدود ریاست (limited state) کی حمایت کرنے کی مزید ایک وجہ ہے جو اپنے وسائل کو خصوصی مفادات کی تکمیل کے بجائے اپنے بنیادی فرائض اور ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لیے مختص کرے۔

نواں باب

معاشیات: تجارت، عالمگیریت اور ترقیاتی امداد

بین الاقوامی تعلقات کے کلاسیکی لبرل نظریے کے بنیادی اجزا کا یہ تعارف اب اس موضوع کی طرف آتا ہے جس کے حوالے سے کلاسیکی لبرلز بین الاقوامی سیاست کی بحث میں سب سے زیادہ معروف ہیں: بین الاقوامی تعلقات میں معاشیات کے کردار سے کیسے نمٹا جائے؟ آزاد تجارت اور امن کے درمیان تعلق کے علاوہ، یہ باب عالمگیریت اور ترقیاتی امداد کا بھی جائزہ لیتا ہے۔

ماہرینِ معاشیات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ 'قلت (scarcity)' یعنی وسائل کا لامحدود نہ ہونا انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر بھی صورتِ حال مختلف نہیں ہے۔ بین الاقوامی معاشیات، اور بالخصوص تجارت، دراصل بین الاقوامی تعاون کی قدیم ترین شکلوں میں سے ایک ہے۔ کلاسیکی لبرل ازم طویل عرصے سے آزاد تجارت کی حمایت سے وابستہ رہا ہے۔ دورِ حاضر کے کلاسیکی لبرلز اس ایجنڈے کی حمایت جاری رکھتے ہیں، لیکن انہوں نے اس کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے عالمگیریت کی حمایت کو بھی اس میں شامل کر لیا ہے۔ تاہم، بین الاقوامی سطح پر ناموزوں معاشی پالیسیوں اور حالات کے مسائل بھی موجود ہیں۔

آزاد تجارت

کلاسیکی لبرلز صدیوں سے آزاد تجارت کی حمایت کرتے آئے ہیں۔ جب سے انسان نے زمین پر آباد ہونا شروع کیا، تجارت بھی انسانی معاشرت کا حصہ رہی ہے۔ جیسا کہ ایڈم سمتھ نے استدلال کیا تھا، 'اشیا کے تبادلے اور لین دین کا رجحان' درحقیقت انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ اس بنیادی خیال کی بارہا تجرباتی شواہد سے بھی تصدیق ہوئی ہے۔

بین الاقوامی تجارت مہارت (specialization) ، تقسیمِ کار اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی جدت کے ذریعے وسائل، اشیا اور خدمات کی زیادہ مؤثر تقسیم کو یقینی بناتی ہے۔ اگرچہ قلیل مدت میں کچھ لوگوں کو نقصان اٹھانا پڑ سکتا ہے، لیکن عمومی طور پر آزاد تجارت لوگوں کو زیادہ خوشحال بناتی ہے—صرف امیر لوگوں کو نہیں بلکہ ہر ایک کو (Panagariya 2019) ۔ تجارت 'معاشی پائی (economic pie) 'کو وسیع کرتی ہے، جس کے نتیجے میں مجموعی خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہ اصول ان ممالک پر بھی لاگو ہوتا ہے جنہیں بظاہر کسی بھی شعبے میں 'مطلق برتری ' (absolute advantage) حاصل نہیں ہوتی اور اس لیے ان کے لیے تجارت کے امکانات محدود دکھائی دیتے ہیں۔ جیسا کہ ریکارڈو (Ricardo 2002) نے نشاندہی کی، ایسے ممالک کو پھر بھی 'تقابلی برتری (comparative advantage) 'حاصل ہو سکتی ہے، جس کے ذریعے وہ اور ان کے تجارتی شراکت دار باہمی تجارت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ان معاشی فوائد کے علاوہ، تجارت خیالات اور ثقافتی تجربات کے تبادلے کو بھی فروغ دیتی ہے، جیسا کہ ہیوم (Hume 1987) نے اپنے مضمون 'تجارت پر حسد (On the Jealousy of Trade) ' میں استدلال کیا تھا۔ یہ بنیادی خیالات اور ان کے مثبت نتائج آج بھی درست ہیں۔

لبرل نقطۂ نظر سے، آزاد تجارت اسی وقت بہترین صورت اختیار کرتی ہے جب وہ واقعی آزاد ہو۔ اس سے مراد دنیا کے کسی بھی حصے میں افراد (یا انفرادی کمپنیوں) کے درمیان ایسی تجارت ہے جس میں حکومتیں یا بین الاقوامی تنظیمیں مداخلت نہ کریں۔ تاہم، اس مقصد کا حصول ہمیشہ مشکل رہا ہے۔ اگرچہ یورپی یونین (EU) کی داخلی منڈی نے اس سمت میں خاصی پیش رفت کی ہے، لیکن یورپی یونین کے اندر بھی تجارت کی راہ میں بعض رکاوٹیں موجود ہیں، جبکہ یورپی یونین کی بیرونی تجارتی پالیسی کو بعض شعبوں میں کھلا اور بعض میں تحفظ پسندانہ (protectionist) سمجھا جاتا ہے۔ اس معاملے میں امریکہ کی صورتِ حال بھی زیادہ بہتر نہیں، جبکہ دنیا کے بیشتر ممالک کی حالت اس سے کہیں زیادہ خراب ہے۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بین الاقوامی تجارت کے بارے میں رویے وقت کے ساتھ مسلسل تبدیل ہوتے رہے ہیں(Irwin 1996) ۔ بعض اوقات آزاد تجارت کو مقبولیت حاصل ہوئی اور معاشی و سیاسی اشرافیہ نے اسے اپنایا، لیکن اس کے برعکس ایسی تحریکیں بھی سامنے آتی رہی ہیں جنہوں نے قوم پرستانہ اور تحفظ پسندانہ (protectionist) جذبات کے زیرِاثر اور غیر لبرل مفکرین سے متاثر ہو کر آزاد تجارت پر پابندیاں عائد کیں۔ حکومتوں نے تقریباً ہمیشہ محصولات (tariffs)، کوٹے (quotas) یا ضوابط (regulations) کے ذریعے تجارت کو محدود کرنے، منظم کرنے یا اس پر ٹیکس عائد کرنے کے لیے مختلف جواز پیش کیے ہیں۔

ارون (Irwin) وضاحت کرتے ہیں کہ قدیم یونانی اور رومی تجارت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور ابتدائی مسیحی کلیسائی رہنماؤں کا رویہ بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ اٹھارویں صدی تک آزاد تجارت کا تصور کلاسیکی لبرل روایت میں مضبوطی سے اپنی جگہ نہیں بنا سکا تھا، یہاں تک کہ ایڈم سمتھ (Smith) نے 1776 میں اپنی معروف تصنیف An Inquiry into the Nature and Causes of the Wealth of Nations اقوام کی دولت کی نوعیت اور اس کے اسباب کی تحقیق (شائع کی۔ تاہم، سمتھ کو آزاد تجارت کے نظریے کا 'موجد' قرار دینا

درست نہیں ہوگا۔ انہوں نے اپنی ذاتی بصیرت اور کام کے علاوہ فرانسیسی فنزیوکریٹس (Physiocrats)، ہسپانوی اسکول آف سلامانکا(School of Salamanca) ، ڈچ مفکرین مثلاً گروشیئس (Grotius) اور برنارڈ مینڈویل (Bernard Mandeville)انگریز اور سکاٹش مفکرین، اور حتیٰ کہ چودھویں صدی کے شمالی افریقی عالم ابنِ خلدون کے خیالات سے بھی استفادہ کیا، انہیں مزید ترقی دی اور اپنے نظریے میں سمویا۔

انیسویں صدی میں تجارت کے حوالے سے شاید سب سے معروف کشمکش سامنے آئی، جس کا آغاز 'مانچسٹر اسکول (Manchester School) ' سے وابستہ کارکنوں، بالخصوص رچرڈ کوبڈن (Richard Cobden)اور جان برائٹ(John Bright) ، نے کیا۔ انہوں نے تحفظ پسندانہ 'کارن لاز (Corn Laws) ' کے خاتمے کے لیے جدوجہد کی اور بالآخر کامیاب ہوئے۔ 1860 میں کوبڈن نے برطانیہ اور فرانس کے درمیان ایک تجارتی معاہدے، کوبڈن-شیولیئر معاہدے(Cobden–Chevalier Treaty) کے لیے مذاکرات بھی کیے۔ تاہم، فریڈرک لسٹ (Friedrich List 1841) سمیت دیگر مفکرین نے ان خیالات کو چیلنج کیا اور تجارت پر ضوابط اور پابندیاں عائد کرنے کے حق میں دلائل پیش کیے۔

اس کے بعد سے ان کے خیالات تحفظ پسند (protectionist) مفکرین کے لیے تحریک کا باعث بنتے رہے ہیں۔

صورتحال میں نمایاں تبدیلی دوسری جنگ عظیم کے بعد آئی، جب 'جنرل اگریمنٹ آن ٹیرفس اینڈ ٹریڈ — (General Agreement on Tariffs and Trade ' GATT) کے تحت ہونے والے مذاکرات کے یکے بعد دیگرے ادوار میں صنعتی ممالک کے درمیان محصولات (tariffs) کی شرحیں کم کی گئیں۔ 1944 کی بریٹن ووڈز کانفرنس (Bretton Woods Conference) میں ایک 'انٹرنیشنل ٹریڈ آرگنائزیشن ' (International Trade Organization — ITO)کے قیام کی تجویز پیش

کی گئی تھی۔اسی وسیع تر انتظام کے نتیجے میں عالمی بینک (World Bank) اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (International Monetary Fund — IMF) کا قیام عمل میں آیا۔چونکہ امریکی کانگریس نے کبھی ITO کی توثیق نہیں کی،اس لیے 1 جنوری 1995 کو 'ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (World Trade Organization — WTO) ' کے قیام تک بین الاقوامی تجارتی مذاکرات GATT کے تحت ہی جاری رہے۔

WTO کے نظام میں تنازعات کے حل کا ایک طریقۂ کار بھی شامل تھا،اور یہ ادارہ غیر محصولاتی رکاوٹوں (non-tariff barriers) میں کمی لانے کے لیے مذاکرات کا ایک اہم مرکز بھی بن گیا۔جیسے جیسے WTO کی رکنیت میں اضافہ ہوااور اس کا ایجنڈا وسیع ہوتا گیا، مختلف مفاداتی گروہوں اور احتجاجی تحریکوں کے دباؤ کے باعث کثیر الجہتی تجارتی مذاکرات کا 'دوحہ راؤنڈ ' (Doha Round)، جس کا آغاز 2001 میں ہوا تھا، عملی طور پر تعطل کا شکار ہو گیا۔اگرچہ اس کے تحت کچھ محدود نوعیت کی پیش رفت ہوئی ہے، لیکن زیادہ تر ممالک نے دوطرفہ یا چند فریقی (plurilateral) تجارتی معاہدوں کے ذریعے مذاکرات آگے بڑھانے کا راستہ اختیار کیا ہے۔

اگرچہ ناقدین WTO کو ایک آزاد عالمی تجارتی نظام کی مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں، سیلی (Sally 2008) کا استدلال ہے کہ آزاد تجارت کے رجحانات بین الاقوامی اداروں سے پیدا نہیں ہوتے۔کلاسیکی لبرلز WTO کو حقیقی معنوں میں آزاد تجارت یعنی ایسی تجارت جس میں زیادہ تر یا تمام رکاوٹیں ختم کر دی جائیں، کے مقابلے میں ایک 'دوسرے درجے کا بہترین حل ' (second-best solution) سمجھتے ہیں۔ جنہیں 'آزاد تجارتی معاہدے (free trade agreements — FTAs) ' کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت ترجیحی تجارتی معاہدے (preferential trade agreements — PTAs) ہوتے ہیں، جن کے تحت بہت سے شعبوں کو بین الاقوامی مسابقت سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔

لہٰذا، WTO اور ترجیحی تجارتی معاہدوں (PTAs) کو حقیقی آزاد تجارت کے برخلاف، ضابطہ بند تجارت کی مثالوں کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔

آزاد تجارت اور امن

لبرل روایت سے وابستہ بہت سے لوگوں کے ہاں تجارت کے ذریعے امن کے قیام کے بارے میں حد سے زیادہ پرامید تصورات پائے جاتے ہیں۔ تاہم، تجارت اور امن کے درمیان کوئی لازمی یا فطری تعلق نہیں ہے (Van de Haar 2010, 2020a)۔ 'تجارت امن کو فروغ دیتی ہے' کے تصور کی بنیاد اس خیال پر ہے کہ سرحدوں کے آر پار اشیا اور خدمات کی خرید و فروخت ایک پُرامن سرگرمی ہے۔

تجارتی معاہدوں پر اتفاق سرحد کے دونوں جانب موجود افراد کے درمیان تعلقات کو فروغ دیتا ہے۔ تجارت کے نتیجے میں قائم ہونے والے یہ تمام انفرادی تعلقات مجموعی طور پر اثرات مرتب کرتے ہیں سب سے بڑھ کر معاشی سطح پر، لیکن سماجی اور سیاسی سطح پر بھی۔ اس عمل کے نتیجے میں ریاستیں ایک دوسرے پر باہمی انحصار کرنے لگتی ہیں۔

چنانچہ، جب ممالک کے رہنما جنگ کے امکان پر غور کرتے ہیں تو انہیں اپنے باہمی تجارتی تعلقات کو پہنچنے والے نقصان اور اس سے وابستہ معاشی اخراجات کو بھی مد نظر رکھنا پڑتا ہے۔ چونکہ وہ عموماً اس نقصان سے بچنے کی خواہش رکھتے ہیں، اس لیے تجارت اس طریقے سے امن کو فروغ دے سکتی ہے۔ اگرچہ یہ خیال کہ آزاد تجارت امن کا باعث بنتی ہے بظاہر بہت پرکشش ہے، لیکن دنیا اور جنگ کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں ہمارے فیصلے اتنے سادہ نہیں ہیں۔

ڈیوڈ ہیوم اور ایڈم سمتھ پہلے ہی اس بات کی نشاندہی کر چکے تھے کہ آزاد تجارت اور امن کے درمیان کوئی خودکار تعلق نہیں ہے۔ اولاً، انسانی فطرت میں اب بھی کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی؛ لہٰذا تشدد

اور تنازعات کا وجود برقرار رہتا ہے، خواہ تجارت کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہو۔ دوم، اگرچہ بین الاقوامی تجارت ایک ملک کے خریداروں اور فروخت کنندگان اور دوسرے ممالک میں ان کے ہم منصبوں کے درمیان ہوتی ہے، لیکن تجارت بعض ریاستوں کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دولت مند بنا سکتی ہے۔ یہی صورتِ حال اس کیفیت کو جنم دے سکتی ہے جسے ہیوم نے ’’تجارت پر حسد ‘ (jealousy of trade) کا نام دیا تھا۔

امیر اقوام کی حکومتیں اپنی اضافی ٹیکس آمدنی کو مزید ہتھیار خریدنے کے لیے استعمال کر سکتی ہیں، جس کے نتیجے میں اسلحے کی دوڑ شروع ہو سکتی ہے اور ایسی خارجہ پالیسی تشکیل پا سکتی ہے جو تنازعات کو مزید ہوا دے۔

تجارت امن کے فروغ کی ضمانت نہیں دیتی، کیونکہ وہ جنگ کے پسِ پشت کارفرما بہت سی دوسری وجوہات کو ختم یا بے اثر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ان میں ثقافتی اور مذہبی اختلافات، قدرتی وسائل بشمول نایاب خام مال کے حصول کی کشمکش، اور بڑی طاقتوں یا ان کے آلہ کاروں کے درمیان سرحدی تنازعات جیسے روایتی تصادم شامل ہیں۔ جیسا کہ جنگی امور کے ماہر کوکر (2014) نے واضح کیا ہے، ریاستیں کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کی خاطر اپنے معاشی مفادات کے برخلاف بھی عمل کر سکتی ہیں۔

تحقیقی شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ کے اسباب عموماً متعدد اور پیچیدہ ہوتے ہیں۔ جنگ اس وقت برپا ہوتی ہے جب لوگوں یا ریاستوں کے پاس اپنے مقاصد یا شکایات کی صورت میں محرکات، جنگ کے لیے درکار وسائل، اور لڑنے کا پختہ عزم موجود ہو۔ جنگ کے اسباب کے اس پیچیدہ مجموعے میں تجارتی تعلقات محض ایک عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کے علاوہ اتفاق، حالات کا رخ، یا عوامی پالیسی پر اثر انداز ہونے والے افراد کے غیر محتاط فیصلے بھی اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

سوگانامی (1996) کے مطابق، بین الاقوامی تجارت کسی صورت جنگ کی روک تھام کا ’’مکمل طور پر مؤثر ذریعہ ‘‘ نہیں ہے۔ آزاد تجارت کے حامی زیادہ سے زیادہ یہی امید کر سکتے ہیں کہ تجارتی

تعلقات کا تحفظ ان عوامل میں سے ایک ہو سکتا ہے جنہیں کوئی حکومت جنگ یا امن کا فیصلہ کرتے وقت پیشِ نظر رکھے۔ تجارت بلاشبہ بعض حالات میں امن کے فروغ میں معاون ثابت ہو سکتی ہے، لیکن یہ فیصلہ سازی پر اثرانداز ہونے والے متعدد عوامل میں سے صرف ایک ہے۔

مثال کے طور پر، 2022 میں روس اور یوکرین کے درمیان تجارتی تعلقات اب بھی موجود تھے، اگرچہ 2014 میں روس کی جانب سے کریمیا کے الحاق کے بعد ان میں نمایاں کمی واقع ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود، یہ تجارتی تعلقات روس کو یوکرین پر حملہ کرنے سے نہ روک سکے۔

تجارت اور امن کے باہمی تعلق سے متعلق بحث ایک نسبتاً جدید بحث، یعنی "جمہوری امن" (democratic peace)، سے مختلف ہے، جسے بعض اوقات "لبرل امن (liberal peace" بھی کہا جاتا ہے۔ اس نظریے کے حق میں قابلِ ذکر مشاہداتی شواہد موجود ہیں کہ مستحکم جمہوریتیں عموماً ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہیں کرتیں، اگرچہ وہ دیگر ریاستوں کے ساتھ جنگ میں ملوث ہو سکتی ہیں، یا جمہوریت کے ابتدائی اور غیر مستحکم مراحل میں ایک دوسرے کے خلاف بھی برسرِ پیکار ہو سکتی ہیں۔

بین الاقوامی تعلقات کے ماہرین اس مشاہدے کی تجرباتی طور پر مضبوط وضاحت تلاش کرنے میں دو دہائیوں سے زائد عرصہ صرف کر چکے ہیں، لیکن اب تک کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ سکے۔ اس کی ایک اہم وجہ اس موضوع کے مطالعے سے وابستہ منہجی مشکلات (methodological problems) ہیں۔

اس نوعیت کی تحقیق میں بعض اوقات تجارت کو ایک متغیر (variable) کے طور پر شامل کیا جاتا ہے۔ تاہم، توجہ عموماً ریاستوں کے درمیان ہونے والی دوطرفہ تجارت پر مرکوز رہتی ہے، جبکہ کثیر الجہتی تجارت اور ایک ہی کمپنی یا کاروباری ادارے کے مختلف حصوں کے درمیان ہونے والی تجارت (intra-firm trade) کو اکثر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ اس کتاب کی تحریر کے وقت تک، اس موضوع پر علمی بحث بدستور جاری ہے۔

عالمگیریت

صرف اس حقیقت سے کہ تجارت بذاتِ خود ہمیشہ امن کے قیام کا باعث نہیں بنتی، یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ تجارت کے دیگر مثبت اثرات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ کلاسیکی لبرلز اس بات پر زور دیتے ہیں کہ آزاد تجارت کا فروغ فی نفسہٖ ایک مثبت امر ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ مزید معاشی آزادی اور تجارت کی لبرلائزیشن کی حمایت کرتے ہیں۔

بین الاقوامی تجارت، جدید ذرائعِ مواصلات، سفر کے وقت میں کمی، فوری خبر رسانی، مالیاتی منڈیوں کے پھیلاؤ اور دیگر تکنیکی ایجادات کے نتیجے میں دنیا پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ باہم مربوط اور ایک دوسرے پر منحصر ہو چکی ہے۔ اس لحاظ سے یہ بات واضح ہے کہ آج کی دنیا ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ عالمگیر (globalized) ہو گئی ہے۔

اگرچہ عالمگیریت کی متعدد تعریفیں موجود ہیں، یہاں اس سے مراد وہ عالمی رجحان ہے جس کے تحت معیشت، کھیل، مواصلات، سفر اور ثقافتی تبادلے کے ذریعے لوگوں کے درمیان باہمی روابط میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

عالمگیریت کلاسیکی لبرل نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ یہ افراد کے لیے زیادہ آزادی اور وسیع تر مواقع کے ساتھ زندگی گزارنے کے امکانات پیدا کرتی ہے، اگرچہ اس کے فوائد کا انحصار مقامی اور مخصوص حالات پر بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، اوسطاً ایک نوجوان مغربی خاتون کو عالمگیریت سے میانمار یا افغانستان میں رہنے والے کسی معمر شخص کی نسبت زیادہ فائدہ حاصل ہونے کا امکان ہے۔ تاہم، عمومی طور پر عالمگیریت سے تقریباً تمام لوگ کسی نہ کسی حد تک فائدہ اٹھاتے ہیں، سوائے ان افراد کے جو انتہائی سخت گیر اور بیرونی دنیا سے تقریباً کٹی ہوئی آمرانہ حکومتوں کے زیرِ اقتدار زندگی بسر کر رہے ہوں۔

عالمگیریت کے بارے میں کم از کم دو دہائیوں سے وسیع اور متعدد جہتوں پر مشتمل بحث جاری ہے۔ بعض ناقدین کا استدلال ہے کہ تجارت اور عالمگیریت ماحول کے لیے نقصان دہ ہیں۔ بعض ٹریڈ یونین کے حامی ان طبقات پر توجہ مرکوز کرتے ہیں جو عالمگیر معیشت میں بڑھتے ہوئے مقابلے کے نتیجے میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ کچھ ناقدین کا یہ بھی کہنا ہے کہ ترقی یافتہ دنیا ترقی پذیر ممالک کی قیمت پر مزید خوش حال ہو رہی ہے، نہ صرف آمدنی کے اعتبار سے بلکہ مغربی کثیر القومی کمپنیوں کی جانب سے غریب ممالک کے لوگوں کے استحصال کے ذریعے بھی، جس میں بچوں سے مشقت لینا بھی شامل ہے۔ یہ محض چند مثالیں ہیں۔

تاہم، بھگواتی (2004) کا استدلال ہے کہ ان میں سے بیشتر اعتراضات یا تو غلط فہمی پر مبنی ہیں، یا پھر جن مسائل کی نشاندہی کی جاتی ہے وہ جزوی یا مکمل طور پر متعلقہ ممالک کی داخلی پالیسیوں اور حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ عصرِ حاضر میں عالمگیریت کے بہت سے مخالفین دراصل سرمایہ داری، کارپوریٹ نظام یا مغرب کے ناقد بھی ہیں۔ مثال کے طور پر مارکسی مفکرین کا استدلال ہے کہ اگرچہ تاریخ میں عالمگیریت کے ایسے ادوار پہلے بھی گزر چکے ہیں جنھوں نے سماجی، ثقافتی اور سیاسی تبادلوں کے ذریعے دنیا کے مختلف خطوں کو ایک دوسرے سے جوڑا، تاہم موجودہ دور کی عالمگیریت کو بنیادی طور پر "عالمی سرمایہ داری (global capitalism)" کے تناظر میں سمجھنا چاہیے (Germain 2018)۔

نوربرگ (2001) اپنی کتاب In Defense of Global Capitalism کے عنوان ہی میں، بظاہر، اس نقطۂ نظر کو تسلیم کرتے ہیں، جبکہ وولف (2005) اپنی کتاب Why Globalization Works میں عصرِ حاضر کی عالمگیریت کے حق میں مفصل دلائل پیش کرتے ہیں۔

بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے کلاسیکی لبرل نظریہ تشکیل دیتے وقت، عالمگیریت اور قومی ریاست کے باہمی تعلق سے متعلق کئی اہم سوالات سامنے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر، کیا عالمگیریت ''عالمی شہریت (cosmopolitan citizenship) ''کے تصور کو فروغ دیتے ہوئے فرد اور اس کی قوم کے درمیان موجود تعلق کو کمزور کر دیتی ہے؟ یہ سوال آج بھی لبرل ازم کے اندر بحث و مباحثے کا موضوع ہے۔

عالمگیریت کا تعلق عالمی معیشت کی آزادی، تجارت کے مواقع میں اضافے، ذرائعِ مواصلات کی وسعت، اور سماجی، سیاسی اور ثقافتی تبادلوں کے فروغ سے ہے۔ اس کے کئی مثبت نتائج بھی سامنے آئے ہیں۔ دنیا بہت سے پہلوؤں سے پہلے کی نسبت بہتر، زیادہ صاف ستھری اور صحت مند بنتی جا رہی ہے، اور نوربرگ (2017) اور روزلنگ (2018) کے نزدیک اس پیش رفت میں سرمایہ داری اور عالمگیریت کا اہم کردار رہا ہے۔

بہت سے کلاسیکی لبرلز کے نزدیک، عالمگیریت سے پیدا ہونے والے متعدد روابط ایسے ہیں جن کے لیے ریاستی حکومتوں کی شمولیت ضروری نہیں۔ افراد، کاروباری ادارے اور مختلف معاشرتی گروہ اپنی آزادانہ سرگرمیوں کے ذریعے سرحدوں کے پار روابط اور تبادلے قائم کر سکتے ہیں۔ تاہم، عالمگیریت کے بعض پہلو ایسے بھی ہیں جن کے لیے ریاستوں کے درمیان قواعد و ضوابط یا باہمی معاہدوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس لحاظ سے، عالمگیر ہوتی ہوئی دنیا کو کئی معنوں میں ریاستوں کی دنیا بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

کلاسیکی لبرلز دنیا بھر میں انفرادی آزادی اور انسانی فلاح و بہبود کے فروغ کے لیے عالمگیریت کا دفاع کرتے ہیں اور اس کے مزید پھیلاؤ کے خواہاں ہیں۔

ترقیاتی امداد

کلاسیکی لبرلز کا مؤقف ہے کہ آزاد تجارت اور عالمگیریت ہر فرد کی خوش حالی اور ترقی کو فروغ دینے کے بہترین ذرائع ہیں، خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو معاشی اعتبار سے کمزور ہیں۔ تاہم، خوش حالی کا انحصار مضبوط ملکی پالیسیوں اور مؤثر اداروں پر بھی ہوتا ہے، مثلاً جائیداد کے حقوق کا تحفظ اور ایک دیانت دار، قابل رسائی اور مؤثر عدالتی نظام۔

بہت سے کلاسیکی لبرلز نے حکومتوں کے درمیان ترقیاتی امداد یعنی ایک حکومت کی جانب سے دوسری حکومت کو فراہم کی جانے والی امداد کی مخالفت کی ہے۔ کلاسیکی لبرل اصول مختصراً یہ ہے : "امداد نہیں، تجارت (Trade, not aid) "۔

ترقی کے ماہر معاشیات پیٹر باؤر (Peter Bauer) ان اولین مفکرین میں شامل تھے جنہوں نے ترقیاتی امداد کے غیر ارادی نتائج کی نشاندہی کی۔ ان کے بقول، ایسی امداد اکثر "امیر ممالک کے غریبوں سے رقم لے کر غریب ممالک کے امیروں تک پہنچانے" کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

حکومتوں کے درمیان رقوم کی منتقلی کی صورت میں دی جانے والی ترقیاتی امداد نے اکثر ترقی پذیر ممالک میں حکمران اشرافیہ کو اقتدار میں برقرار رکھنے میں مدد دی ہے، جبکہ امداد حاصل کرنے والے ممالک کی عام آبادی کے حالات شاذ ہی بہتر ہوئے ہیں۔

کلاسیکی لبرلز اور دیگر مفکرین کا استدلال ہے کہ غریب ممالک کے خوش حال ہونے کے امکانات اس وقت زیادہ ہوتے ہیں جب وہ بہتر ملکی پالیسیاں اختیار کریں۔ ان میں منصوبہ بند معیشتوں کا خاتمہ، معاشرتی اور اقتصادی زندگی میں آزادی کو فروغ دینا، اور باہمی تجارت کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ معیشتوں سے تجارت میں اضافہ شامل ہیں۔ ترقی کا انحصار بنیادی طور پر خود لوگوں پر ہوتا ہے۔ انہیں اپنے حالاتِ زندگی بہتر بنانے کے مواقع فراہم کیے جانے چاہییں۔

باؤر، لڈوِگ فان مائسز (Ludwig von Mises) اور ایف۔اے۔ہائیک (F. A. Hayek) کے دوست تھے، اور یہ دونوں مفکرین بھی ریاستوں کے درمیان ترقیاتی امداد کے سخت مخالف تھے۔

مائسز کا استدلال تھا کہ صرف سرمایہ داری اور 'لیزے فیئر (laissez-faire) ' یعنی معیشت میں ریاستی مداخلت سے گریز پر مبنی پالیسیاں ہی غریب لوگوں کے حالات بہتر بنانے میں مدد دے سکتی ہیں۔ ان کے نزدیک مغرب کو ان ممالک کے بارے میں احساسِ جرم میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں تھی، جو اکثر سابق نوآبادیات تھے اور اقتصادی ترقی حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بہت سے معاملات میں ان ممالک کی اپنی اجتماعی (collectivist) معاشی پالیسیاں ہی ان کی غربت کی بنیادی وجہ بنی تھیں۔

ہائیک نے بھی اس مؤقف کی مکمل تائید کی۔ انہوں نے نشاندہی کی کہ نئے آزاد ہونے والے ممالک کے رہنماؤں نے اکثر اپنے سوشلسٹ نظریات ان مغربی جامعات سے حاصل کیے تھے جہاں انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے نزدیک، خراب پالیسیاں ہی ممالک کو غریب رکھتی ہیں۔

اس کی ایک مثال وہ انتہائی تیز رفتار صنعتی عمل تھا جسے بہت سے ممالک نے اختیار کیا۔ اس عمل نے زرعی پالیسیوں کی مناسب تشکیل اور ارتقا کو نقصان پہنچایا، حالاں کہ ایسی پالیسیاں غذائی ترسیل کے نظام (food chain) میں پیدا ہونے والی قلت سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ باؤر، مائسز اور ہائیک کا عمومی مؤقف یہ تھا کہ سرمایہ داری کے بغیر یہ ممالک مزید غربت میں مبتلا ہو جائیں گے (Van de Haar 2009)۔

کلاسیکی لبرل خیالات کو متعدد ماہرینِ معاشیات کی تجرباتی تحقیق نے مزید تقویت دی ہے اور ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ ان میں ایسٹرلی (Easterly, 2002, 2013) اور زیمبیا کی مصنفہ مویو (Moyo, 2009) شامل ہیں، جنہوں نے خود کو پیٹر باؤر (Peter Bauer) کی فکری روایت کا پیروکار قرار دیا ہے۔ نوبیل انعام یافتہ ماہرینِ معاشیات بنرجی (Banerjee)

اور ڈفلو (Duflo، 2011 (شاید خود کو کلاسیکی لبرل نہ سمجھتے ہوں، لیکن غریب لوگوں کی روزمرہ زندگی اور ان کے طرزِ عمل کے بارے میں ان کی تجرباتی تحقیق اکثر ایسے شواہد فراہم کرتی ہے جو کلاسیکی لبرل مؤقف سے ہم آہنگ ہیں۔ پامر (Palmer) اور وارنر (Warner, 2022) اس امر پر زور دیتے ہیں کہ خوش حالی کا حصول اسی وقت ممکن ہے جب افراد کو خود مختار اور اپنے معاملات کے ذمہ دار فاعل (self-governing agents) کے طور پر تسلیم کیا جائے اور ترقی کے لیے 'وقار کو اولین ترجیح (dignity-first) ' کا نقطۂ نظر اختیار کیا جائے۔
اگرچہ کلاسیکی لبرلز دوطرفہ اور کثیر الجہتی بنیادوں پر حکومتوں کی جانب سے دی جانے والی ترقیاتی امداد کے بارے میں شکوک و شبہات رکھتے ہیں، لیکن وہ غیر ریاستی فلاحی سرگرمیوں کے مخالف نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کو فنڈز جمع کرنے اور انہیں اپنی، اپنے عطیہ دہندگان اور امداد کے مستحقین کی صوابدید کے مطابق خرچ کرنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ ان تنظیموں کے مقاصد اور ان کی کارکردگی بنیادی طور پر انہی کی ذمہ داری ہیں۔ تاہم، کلاسیکی لبرلز بین الاقوامی سطح پر سرگرم بعض این جی اوز کی پالیسیوں سے اختلاف کر سکتے ہیں، کیونکہ یہ تنظیمیں اکثر سرپرستانہ (paternalistic) رویہ اختیار کرتی ہیں اور بعض اوقات تجارتی تحفظ پسندی (trade protectionism) اور دیگر سوشلسٹ پالیسیوں کی حمایت بھی کرتی ہیں۔
قدرتی آفات یا مسلح تنازعات کے بعد فوری غیر ملکی ہنگامی امداد کی ضرورت کے بارے میں عموماً بہت کم اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم، تعمیرِ نو سے متعلق پالیسیاں بعض اوقات حکومتوں کے اختیار اور کنٹرول میں اضافے اور معاشی آزادی کو محدود کرنے کا سبب بن سکتی ہیں۔ مجموعی طور پر، کلاسیکی لبرلز کا یقین ہے کہ اگرچہ سرکاری ترقیاتی امداد کبھی کبھار مطلوبہ مستحقین اور سب سے زیادہ ضرورت مند افراد تک پہنچ سکتی ہے، لیکن کسی ملک کی داخلی پالیسیاں اور لوگوں کے درمیان آزادانہ باہمی روابط اس کی ترقی اور خوش حالی کے لیے کہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

بنیادی تصورات کو یکجا کرنا

کلاسیکی لبرل نظریۂ بین الاقوامی تعلقات کے اہم ترین بنیادی تصورات اب ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ایک بار پھر یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ان میں سے ہر تصور کے بارے میں اس سے کہیں زیادہ تفصیل بیان کی جا سکتی ہے، اور اکثر بیان کی بھی گئی ہے۔تاہم، یہاں مقصد نظریے کی ہر جزئیات پر بحث کرنا نہیں بلکہ اس کے بنیادی خد و خال پیش کرنا ہے۔مزید یہ کہ جیسا کہ دیباچے میں بھی واضح کیا گیا تھا، کوئی بھی نظریہ کبھی مکمل نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ تمام ممکنہ سوالات یا مسائل کا احاطہ کر سکتا ہے۔

اس کے باوجود، بین الاقوامی تعلقات کے دیگر نظریات کے مقابلے میں کلاسیکی لبرل نظریہ:

- بنیادی اصولوں (first principles) سے جنم لیتا ہے؛
- اپنے اہم ترین مفکرین کے نظریات اور تصورات میں مضبوط بنیاد رکھتا ہے، جن میں صدیوں کے دوران خاطر خواہ فکری تسلسل اور باہمی مماثلت پائی جاتی ہے؛
- دیگر بیشتر (لبرل) نظریاتِ بین الاقوامی تعلقات کے مقابلے میں زیادہ وسیع پیمانے پر تصورات کو شامل کرتا ہے؛
- اور بین الاقوامی تعلقات کے متعدد سوالات کا تجزیہ کرنے اور ان کے جوابات و حل فراہم کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔

کلاسیکی لبرل نظریۂ بین الاقوامی تعلقات ایک نچلی سطح سے اوپر کی جانب (bottom-up) تشکیل پانے والا نظریہ ہے، جو انسانی فطرت اور افراد و گروہوں کے باہمی تعلقات کے بارے میں ایک حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر پر مبنی ہے۔ان گروہوں میں بالخصوص قوم اور ریاست شامل ہیں۔

بہت سے کلاسیکی لبرلز کے لیے یہ فطری امر ہے کہ وہ قومی ریاست کو بین الاقوامی تعلقات کا بنیادی فاعل سمجھیں۔

کلاسیکی لبرل ازم تنازع اور جنگ کے ناگزیر ہونے کو تسلیم کرتا ہے اور ان افسوس ناک واقعات سے نمٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک طرف یہ کام خود بخود پیدا ہونے والی نظم و ترتیب کی قوتوں، مثلاً طاقت کے توازن (balance of power)، کے ذریعے کیا جا سکتا ہے؛ دوسری طرف، کلاسیکی انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے محدود مگر مضبوط بین الاقوامی قانون، اور محدود تعداد میں ایسے فعال بین الاقوامی بین الحکومتی اداروں کی ضرورت ہے جو مخصوص عملی مقاصد پورے کریں۔

اس کے ساتھ ساتھ مضبوط سرمایہ دارانہ اصولوں کا اطلاق بھی ضروری ہے، جن میں آزاد تجارت شامل ہے۔ اگرچہ آزاد تجارت امن کے قیام کا سبب نہیں بنتی، لیکن اس کے دیگر بے شمار اور غیر معمولی فوائد ہیں۔ اسی طرح عالمگیریت اور حکومتوں کے مابین ترقیاتی امداد کے بارے میں شکوک و شبہات بھی کلاسیکی لبرل نقطۂ نظر کا حصہ ہیں۔

آخر میں، ضبط و تحدید (restraint) کا اصول بھی اہم ہے: فوجی مداخلت کو آخری چارۂ کار کے طور پر استعمال کیا جائے؛ ہجرت پر کچھ حدود عائد کی جا سکتی ہیں، اگرچہ یہ اب بھی کلاسیکی لبرل مباحث کا ایک موضوع ہے؛ سامراجیت کے لیے کوئی جگہ نہیں؛ اور نہ ہی قوم پرستی جیسے اجتماعی (collectivist) تصورات کے لیے۔

خلاصہ یہ کہ کلاسیکی لبرل نظریۂ بین الاقوامی تعلقات کی ساخت اور بنیادی تصورات کو جدول 3 میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

جدول 3: کلاسیکی لبرل نظریۂ بین الاقوامی تعلقات کی ساخت

زمرہ	تصورات
بنیادی تصورات	انسانی فطرت کے بارے میں حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر؛ قوم؛ ریاست؛ خود مختاری؛ عادلانہ جنگ؛ طاقت کا توازن؛ آزاد تجارت؛ عالمگیریت
متعلقہ تصورات	انسانی حقوق؛ سفارت کاری؛ بین الاقوامی قانون؛ بین الاقوامی تنظیمیں
ثانوی تصورات	ہجرت؛ فوجی مداخلت؛ وفاق (آخری چارۂ کار کے طور پر)

یہ بات اہم ہے کہ سامراج، قوم پرستی اور حکومتوں کے مابین ترقیاتی امداد کے لیے کلاسیکی لبرل نظریۂ بین الاقوامی تعلقات میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

حصہ سوم: بین الاقوامی تعلقات کا نظریہ

دسواں باب

بین الاقوامی تعلقات (IR) کے لبرل نظریات

حیرت انگیز طور پر، بین الاقوامی تعلقات (IR) کے میدان میں لبرل ازم کے وسیع پیمانے پر تسلیم شدہ اثر ورسوخ کے باوجود، اس موضوع پر موجود علمی لٹریچر نسبتاً محدود ہے۔ کلاسیکی لبرل ازم اور بین الاقوامی تعلقات کے نظریے کے باہمی تعلق کے حوالے سے تو یہ علمی مواد مزید کم ہے۔ جورجینسن (Jorgensen, 2021) ان چند ماہرینِ تعلیم میں سے ہیں جنھوں نے اپنی حالیہ مرتب کردہ کتاب میں اس موضوع کا ایک جامع جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اگرچہ ان کا جائزہ بنیادی طور پر یورپی نقطۂ نظر تک محدود ہے۔

اس حصے میں ہم اس موضوع کو مزید وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ سب سے پہلے، ہم کلاسیکی لبرل نظریۂ بین الاقوامی تعلقات اور بین الاقوامی تعلقات کے دیگر لبرل نظریات کے باہمی تعلق کا جائزہ لیں گے۔ اگلا باب اس سوال پر توجہ مرکوز کرے گا کہ بین الاقوامی تعلقات کے وسیع تر نظریاتی ڈھانچے میں کلاسیکی لبرل نظریۂ بین الاقوامی تعلقات کو کس طرح سمجھا جائے۔ اس حصے کا تیسرا باب بین الاقوامی تعلقات کے مسائل کے بارے میں لبرٹیرینز (libertarians) کے نقطۂ نظر پیش کرے گا۔ اس طرح، اس تیسرے حصے کا مجموعی مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ کلاسیکی لبرل

ازم، لبرل نظریۂ بین الاقوامی تعلقات کے وسیع تر فکری ڈھانچے میں کہاں اور کس طرح جگہ بناتا ہے۔

ایک عمومی تعارف کے بعد، یہ باب بین الاقوامی تعلقات کے اہم لبرل نظریات کا مختصر جائزہ پیش کرتا ہے:

- لبرل بین الاقوامیت(Liberal internationalism)
- (نیو)لبرل ادارہ جاتی نظریہ((Neo-) (liberal institutionalism)
- فنکشنل ازم اور باہمی انحصار (Functionalism and interdependence)
- نظامِ ضوابط کا نظریہ(Regime theory)
- پیوند شدہ/سرایت لبرل ازم(Embedded liberalism)
- لبرل امن کا نظریہ(Liberal peace theory)
- دیگر لبرل نظریات

لبرل نظریۂ بین الاقوامی تعلقات کے خدوخال

زاکر اور میتھیو(Zacher and Matthew, 1995) لبرل ازم کو ترقی پسند (progressive)، تعاون پر مبنی (cooperative) اور جدیدیت پسند (modernist)قرار دیتے ہیں۔ یہ اس حقیقت کے پیش نظر اہم ہے کہ ایک طویل عرصے تک بین الاقوامی تعلقات کے نظریے میں حقیقت پسندی (realism) دوسرا غالب نظریاتی نمونہ رہی ہے۔ زاکر اور میتھیو کے مطابق ''ترقی پسند'' کی اصطلاح، جس کا تعلق سماجی لبرل ازم سے ہے اور جس کا تعارف کتاب کے پہلے حصے میں کرایا گیا ہے، اس یقین کی عکاسی کرتی ہے کہ لبرلز کا نقطۂ

نظر انسانی عقل و استدلال کی قوت اور اس کے استعمال کی بنیاد پر امن، خوش حالی اور انصاف قائم کر کے انسانی آزادی کو زیادہ فروغ دے گا۔

لبرل ازم کو "تعاون پر مبنی" بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ ریاستوں اور دیگر بین الاقوامی فاعلوں کے درمیان تعاون پر زور دیتا ہے۔ اسے "جدیدیت پسند" اس لیے کہا جاتا ہے کہ لبرلز کے نزدیک لبرل جمہوریت، بین الاقوامی باہمی انحصار اور اداروں جیسے تصورات کو اپنانے، نیز مختلف گروہوں اور افراد کو باہم مربوط کرنے کے ذریعے بین الاقوامی تعلقات کو تبدیل اور دنیا کو جدید بنایا جا سکتا ہے۔

زاکر اور میتھیو کے نزدیک یہ تین عناصر عالمی سیاست کے بارے میں لبرل ازم کے بنیادی خیالات کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں، اگرچہ وہ لبرل نظریۂ بین الاقوامی تعلقات کی مختلف شاخوں میں بھی امتیاز کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک لبرل ازم دنیا کے اخلاقی کردار اور مادی بہبود میں ایک بنیادی اور ڈرامائی بہتری کا علم بردار ہے۔ یہ بڑے دعوے ہیں، جنہیں لبرل نظریۂ بین الاقوامی تعلقات کے ماہرین اکثر کسی نہ کسی شکل میں دہراتے ہیں۔ چنانچہ یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ لبرلز کو اکثر مثالی (idealists) یا خیالی دنیا کے حامی (utopians) بھی کہا جاتا ہے۔

کلاسیکی لبرل نظریے کے مقابلے میں، جسے اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے، بیشتر دیگر لبرل نظریات کی بنیاد سیاسی فلسفے میں اتنی مضبوط نہیں ہے۔ صرف چند نظریات واضح طور پر لبرل سیاسی مفکرین کی تحریروں سے استفادہ کرتے ہیں، جبکہ دوسرے محض ایک یا چند لبرل تصورات اختیار کر کے انہیں اپنے "لبرل" نظریے کی بنیاد بنا لیتے ہیں۔ کم از کم یہ نتیجہ زیادہ متاثر کن نہیں کہا جا سکتا۔

لبرل بین الاقوامیت پر اپنی کتاب میں جان (Jahn, 2013) نے نشاندہی کی ہے کہ بین الاقوامی تعلقات کے نظریے میں لبرل ازم منتشر، متنوع اور ناقص، یا زیادہ سے زیادہ جزوی طور پر، متعین شدہ ہے؛ مزید یہ کہ اس کا لبرل سیاسی نظریے کے ساتھ واضح تعلق اکثر موجود نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر، جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے، موجودہ دور کے بہت سے لبرل نظریاتِ بین الاقوامی تعلقات مجموعی طور پر سماجی لبرل نوعیت کے ہیں، جس کے باعث ان میں سماجی انصاف پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ یہ رجحان مکمل یا جزوی طور پر جان رالز (John Rawls) کے کام، بالخصوص ان کی شہرۂ آفاق کتاب A Theory of Justice, Rawls,1995 سے ماخوذ ہے۔ اس کتاب کو بیسویں صدی میں سیاسی فلسفے کی سب سے زیادہ بااثر کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ رالز نے انصاف کو انصاف پر مبنی برابری (fairness) کے طور پر متعین کیا اور اس کا خیال تھا کہ ایک منصفانہ معاشرے کو کلاسیکی انسانی حقوق کا تحفظ کرنا چاہیے، لیکن اس کے ساتھ دو اصولوں کی پابندی بھی ضروری ہے:

1. سب کے لیے مساوی مواقع ہوں؛
2. امیر لوگوں کی ترقی اسی صورت میں جائز قرار دی جاسکتی ہے جب اس سے غریب لوگوں کو بھی اتنا ہی فائدہ پہنچے۔

تاہم، رالز کا یہ نظریہ صرف اپنی سرحدوں کے اندر موجود معاشروں کی داخلی سیاست کے لیے تھا۔ اپنی کتاب The Law of Peoples, Rawls, 2002 میں انہوں نے اپنے نظریے کے بین الاقوامی معاملات پر اطلاق کے نتائج کا جائزہ لیا۔ بہت سے ایسے دانشوروں، جو ان کے فکری مداح تھے، کی مایوسی کے بر خلاف، رالز اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کا سابقہ نظریہ بین الاقوامی سطح پر قابلِ اطلاق نہیں تھا۔ چنانچہ وہ منصفانہ ریاستوں پر مشتمل کسی عالم گیر (cosmopolitan) عالمی نظام کے قائل نہیں تھے۔

اس کے بجائے، ان کا نتیجہ یہ تھا کہ دنیا میں صرف محدود تعداد میں ریاستیں ہی منصفانہ ہو سکتی ہیں۔ نتیجتاً، ان کا بین الاقوامی نظریہ اس سوال پر مرکوز ہو گیا کہ یہ چند منصفانہ ریاستیں ان بڑی اور زیادہ متنوع تعداد میں موجود غیر منصفانہ ریاستوں کے ساتھ کس طرح معاملہ کریں گی، جو انصاف کو ایک مختلف انداز میں سمجھتی ہیں۔ رالز نے بین الاقوامی عدم مساوات کو ایک موجود حقیقت کے طور پر

قبول کیا۔ یہ بات اہم ہے کہ رالز نے داخلی سیاست میں انصاف اور بین الاقوامی سیاست میں انصاف کے درمیان واضح امتیاز قائم کیا ہے۔

تمام جدید لبرل نظریاتِ بین الاقوامی تعلقات اس نوعیت کا امتیاز قائم نہیں کرتے۔ تاہم، زاکر اور میتھیو کی پیش کردہ بحث سے کچھ زیادہ تفصیل میں جائیں تو لبرل نظریاتِ بین الاقوامی تعلقات میں چند مشترک تصورات پائے جاتے ہیں۔ ان میں درج ذیل اعتقادات شامل ہیں:

- عالمی امن کا حصول ممکن ہے، کیونکہ انسانوں کو اتنا عقلی سمجھا جاتا ہے کہ وہ جنگ اور تنازع پر قابو پا سکیں؛
- قومی ریاست عالمی معاملات میں ایک مسئلہ بن سکتی ہے، جس کے اختیار کو محدود کرنے کی ضرورت ہے، خصوصاً ان مبینہ "جنگ پسند" اشرافیہ کا، جن میں سفارت کار، فوجی کمانڈر اور/یا نام نہاد فوجی صنعتی کمپلیکس شامل ہیں؛
- مفاداتی گروہوں اور عوامی رائے کا خارجہ پالیسی کے فیصلوں پر ایک مبینہ پُرامن اثر ہوتا ہے؛
- امن پر مبنی خارجہ پالیسیوں کو داخلی ادارہ جاتی انتظامات کے ذریعے بھی فروغ دیا جا سکتا ہے، خصوصاً جمہوریت کے ذریعے؛
- بین الحکومتی اور غیر سرکاری تنظیموں، بین الاقوامی نظامِ ضوابط اور بین الاقوامی قانون کا ایک اہم کردار ہے، تاکہ طاقت کی سیاست کے اثرات پر قابو پایا جا سکے یا انہیں غیر مؤثر بنایا جا سکے اور قومی ریاست سے کچھ اختیارات واپس لیے جا سکیں؛
- بین الاقوامی تجارت امن کے فروغ میں مدد دیتی ہے؛
- اور، زیادہ حالیہ دور میں، جمہوریت کے فروغ کے لیے انسانی بنیادوں پر مداخلت (humanitarian intervention) کی حمایت بھی اس میں شامل ہو گئی ہے۔

مختصراً، اس نظریے کا بنیادی تصور یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر مل جل کر کام کیا جائے، بین الاقوامی تعاون کے ذریعے ریاست کے کردار کو کم کیا جائے، امن کو فروغ دیا جائے، اور داخلی سطح پر ایسے ادارہ جاتی نظام کو مضبوط کیا جائے جو ان مقاصد کو آگے بڑھائے۔ یقیناً، یہ دنیا کے بارے میں ایک خاصا پُرامید نقطۂ نظر ہے۔

لبرل بین الاقوامیت

بین الاقوامی تعلقات کا قدیم ترین لبرل نظریہ لبرل بین الاقوامیت (Liberal internationalism) ہے۔اس کا مقصد محض بین الاقوامی تعلقات کی وضاحت کرنا نہیں تھا، بلکہ دنیا کی اصلاح بھی تھا تاکہ اسے زیادہ پُرامن بنایا جاسکے۔ لبرل بین الاقوامیت کے حامی انسانی فطرت کے بارے میں کلاسیکی لبرلز کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ مثبت نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ریاستی اقدامات کے ذریعے عالمی معاملات میں پائیدار تبدیلی لانا ممکن ہے۔ لبرل بین الاقوامیت کی جڑیں اٹھارہویں اور انیسویں صدی تک پہنچتی ہیں۔ برطانیہ میں اس کی ابتدا کوبڈن (Cobden) کی آزاد تجارت اور عدم مداخلت کی حمایت، بینتھم (Bentham) کی بین الاقوامی قانون پر زور دینے والی فکر، اور کانٹ (Kant) کے بین ریاستی سطح پر ایک ماورائے قومی تنظیم کے تصور تک پہنچائی جاسکتی ہے۔

اگرچہ لبرل بین الاقوامیت کے بہت سے مختلف نظریہ دان ہیں اور ہر ایک نے اس نظریے کی اپنی مخصوص صورت پیش کی ہے، تاہم ان سب میں چند بنیادی خیالات مشترک ہیں۔ یہ خیالات بڑی حد تک ان اہم خصوصیات سے مماثل ہیں جو اوپر لبرل نظریۂ بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے بیان کی جاچکی ہیں۔ یہ بات خود لبرل بین الاقوامیت کے دیرپا اثر ورسوخ کی بڑی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے۔

اس کے علاوہ:

- لبرل بین الاقوامیت کے حامی سفارت کاری، جنگ اور طاقت کے توازن پر تنقید کرتے ہیں اور ان سے بچنے یا انہیں ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔
- بین الاقوامی اصلاح کے لیے داخلی اصلاح ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے سفارت کاروں اور جرنیلوں کے اثر ورسوخ کو کم کرنا، مبینہ طور پر پُرامن عوام کے اثر ورسوخ کو بڑھانا، اور گزشتہ چند دہائیوں میں جمہوریتوں کے فروغ کی کوشش کرنا شامل ہے۔
- بین الاقوامی تنظیموں کا قیام مفید ہے، اسی طرح بین الاقوامی قانون، قواعد اور اصولوں کی تشکیل اور ان کا نفاذ بھی اہم ہے۔ لبرل بین الاقوامیت کے حامیوں کا خیال ہے کہ بین الاقوامی تنظیمیں عالمی سطح پر موجود بے نظمی پر قابو پانے اور بین الاقوامی انصاف کو فروغ دینے میں مدد دیتی ہیں۔
- بین الاقوامی، بالخصوص معاشی، باہمی انحصار کو بڑھانے سے بین الاقوامی تعلقات میں تنازعات کے پُرامن حل کی حوصلہ افزائی ہو گی۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں قائم ہونے والی قدیم ترین بین الاقوامی تنظیموں کا مقصد بنیادی طور پر تکنیکی معاملات میں بین الاقوامی تعاون کو فروغ دینا تھا۔ ان میں سب سے پہلی انٹرنیشنل ٹیلی گراف یونین (International Telegraph Union, ITU) تھی، جو 1865ء میں قائم ہوئی اور بعد میں انٹرنیشنل ٹیلی کمیونیکیشن یونین بن گئی۔

لبرل بین الاقوامیت کے حامی تنازعات کے تصفیے کے لیے بین الاقوامی ثالثی (international arbitration) پر بھی خاص زور دیتے تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں بین الاقوامی قانون کی ترقی پر مزید توجہ دی جانے لگی۔ اس مقصد کے لیے دی ہیگ (The Hague) میں امن کانفرنسوں کا ایک سلسلہ منعقد ہوا، جہاں بعد میں محلِ امن (Peace

(Palace) تعمیر کیا گیا۔ اس کی تعمیر کے اخراجات کا بڑا حصہ امریکی فولاد کے صنعت کار اور مخیر شخصیت اینڈریو کارنیگی (Andrew Carnegie) نے فراہم کیا تھا۔

بین الاقوامی تعلقات کے بعض نظریہ دان امریکی صدر وُڈرو ولسن (Woodrow Wilson) کی 1918ء کی چودہ نکاتی تقریر (Fourteen Points) کو لبرل بین الاقوامیت کا نقطۂ عروج قرار دیتے ہیں۔ اس تقریر میں صدر ولسن نے پہلی جنگ عظیم کے بعد کی دنیا کے بارے میں اپنے تصورات پیش کیے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ امن کے معاہدے کھلے عام اور کھلے طریقے سے طے کیے جائیں، بین الاقوامی اقتصادی لین دین آزاد ہو، سمندروں کو آزادی حاصل ہو، قومی اسلحے میں کمی کی جائے، نوآبادیاتی اقوام کو حقِ خود ارادیت دیا جائے، اور ایک ایسی عمومی انجمنِ اقوام قائم کی جائے جو بڑی اور چھوٹی تمام ریاستوں کی سیاسی آزادی اور علاقائی سالمیت کی ضمانت دے۔(Wilson, 1918)

اسی تصور کے نتیجے میں پہلی جنگ عظیم کے بعد لیگ آف نیشنز (League of Nations) کا قیام عمل میں آیا۔ اسے مستقبل کی جنگوں کے سدِ باب کے ایک ممکنہ ذریعے کے طور پر دیکھا گیا، جو اس زمانے کے جامعات میں قائم ہونے والے بین الاقوامی تعلقات کے علمی شعبوں میں رائج فکر سے بھی ہم آہنگ تھا۔

لبرل بین الاقوامیت کی تاریخ کے بارے میں بہت کچھ مزید بیان کیا جا سکتا ہے، جس پر یورگنسن (Jorgensen, 2018, 2021) نے ایک متوازن تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کا نتیجہ یہ ہے کہ لبرل بین الاقوامیت مکمل طور پر ناکام رہی ہے، کیونکہ اس کا بنیادی مقصد — تنازعات اور جنگوں سے بچاؤ — کبھی بھی حقیقتاً حاصل ہونے کے قریب نہیں پہنچ سکا۔

دوسری طرف، لبرل بین الاقوامیت کے نظریات اپنا اثر برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ مثال کے طور پر، اگرچہ لیگ آف نیشنز کو عمومی طور پر ایک ناکام تجربہ سمجھا گیا، لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد اس کی جگہ اقوامِ متحدہ (United Nations, UN) نے لے لی۔ اس کے ساتھ

بریٹن وُوڈز نظام (Bretton Woods system) کے تحت قائم ہونے والی بین الاقوامی تنظیمیں بھی وجود میں آئیں، اور اس کے بعد سے متعدد دیگر بین الاقوامی تنظیمیں اور بین الاقوامی نظامِ ضوابط (regimes) بھی وجود میں آتے گئے۔

لبرل ادارہ جاتی نظریہ(Liberal Institutionalism)

کئی حوالوں سے لبرل ادارہ جاتی نظریہ — جسے بعض اوقات نومُست لبرل ادارہ جاتی نظریہ (neoliberal institutionalism) بھی کہا جاتا ہے — لبرل بین الاقوامیت (liberal internationalism) کی ایک جدید صورت ہے۔ اس نظریے اور روایتی لبرل بین الاقوامیت کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ لبرل ادارہ جاتی نظریہ بین الاقوامی تعلقات میں ریاستوں کے مرکزی کردار کو تسلیم کرتا ہے۔ تاہم، اس کے ساتھ ساتھ یہ بین الحکومتی اداروں اور بین الاقوامی تنظیموں کے ذریعے ریاستوں کے مبینہ منفی رویوں کو محدود کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان اداروں اور تنظیموں کو بین الاقوامی نظام میں نظم واستحکام اور امن کے فروغ کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

لبرل ادارہ جاتی نظریے کے حامی عموماً اہم بین الاقوامی تنظیموں، مثلاً اقوامِ متحدہ، عالمی بینک، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور عالمی تجارتی تنظیم پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ تاہم، وہ متعدد اہم بین الاقوامی معاہدوں، مثلاً جوہری عدم پھیلاؤ کے معاہدے، اور علاقائی تعاون کی تنظیموں، مثلاً آسیان (ASEAN) اور خلیجی تعاون کونسل، کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔

اس نظریے میں سابقہ 'نیو (neo) ' یا مکمل اصطلاح 'نیو لبرل ادارہ جاتی نظریہ ' ایک نئے اور زیادہ مثبت پسند (positivist) منہجی نقطۂ نظر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ تاہم، یہ امر اب بھی زیرِ

بحث ہے کہ آیا لبرل ادارہ جاتی نظریے اور نیو لبرل ادارہ جاتی نظریے کے درمیان واقعی کوئی نمایاں فرق موجود ہے یا نہیں (Stein, 2008)۔

اسی طرح حقیقت پسندی (realism) بھی نو حقیقت پسندی (neorealism) کی صورت میں ایک نئی شکل کے ساتھ سامنے آئی۔ اس کے نتیجے میں بین الاقوامی تعلقات کے نظریاتی مباحث میں نام نہاد 'نیو-نیو (neo-neo)' بحث کا آغاز ہوا، جو کئی برسوں تک اس شعبے کی نظریاتی بحث پر غالب رہی۔

لبرل ادارہ جاتی نظریے کے حامی ان امکانات کا بھی جائزہ لیتے ہیں جن کے تحت ریاستیں بین الاقوامی نظاموں اور اداروں کے اندر باہمی تعاون کر سکتی ہیں۔ ان کی استعمال کردہ اصطلاحات بڑی حد تک اس علمی کوشش کی عکاسی کرتی ہیں جس کے ذریعے وہ قدرتی علوم (natural sciences) کے طریقۂ کار کو بین الاقوامی تعلقات کے مطالعے میں بروئے کار لانا چاہتے ہیں۔

مثال کے طور پر، وہ بین الاقوامی اداروں کے ساتھ معاملات میں حکومتوں کو حاصل ہونے والے 'مطلق فوائد (absolute gains)' اور 'نسبتی فوائد (relative gains)' کی بات کرتے ہیں۔ یہ تصور گیم تھیوری (game theory) سے ماخوذ ہے۔

یہ بحث محض نظری اور تجریدی نوعیت کی نہیں ہے۔ گوڈارڈ اور کریبس (Goddard and Krebs, 2021) کا استدلال ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد —— جب امریکہ کم از کم دو دہائیوں تک دنیا کی واحد سپر پاور رہا —— لبرل بین الاقوامیت اور لبرل ادارہ جاتی نظریہ امریکی خارجہ پالیسی کے اہم عناصر رہے ہیں، جن کے ذریعے امریکی طاقت کو جواز فراہم کیا گیا۔

فنکشنل ازم اور باہمی انحصار

کچھ لبرل ادارہ ساز، خصوصاً یورپ میں، بڑھتے ہوئے غیر قومی انضمام (supranational integration) کے حامی ہیں۔ اس تصور کے مطابق، اگر ریاستیں اپنی خود مختاری اور وسائل کو علاقائی یا حتیٰ کہ عالمی تنظیموں میں مشترکہ طور پر استعمال کرنے کے لیے جمع کر دیں تو اس کے نتیجے میں امن اور خوش حالی کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

اس تصور کی ایک ابتدائی شکل، جسے فنکشنل ازم (functionalism) کہا جاتا ہے، ڈیوڈ مٹرینی (David Mitrany) نے پیش کی تھی (Ashworth، 1999)۔ ان کا استدلال تھا کہ بین الاقوامی اصلاحات کا انحصار بین الحکومتی طریقۂ کار کے بجائے بین الاقوامی انجمنوں کے قیام پر ہونا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسی ٹیکنوکریٹک اور مخصوص وظائف پر مبنی بین الاقوامی تنظیمیں قائم کی جانی چاہییں جو بین الاقوامی سطح پر منصوبہ بندی کو فروغ دے سکیں۔

فنکشنل ازم کو بین الاقوامی باہمی انحصار (international interdependence) کے تصور کی ایک شکل کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے، جس کا پہلے آزاد تجارت اور امن کے تناظر میں جائزہ لیا جا چکا ہے۔ کیوہین اور نائی (Keohane and Nye، 1989) نے اپنی کتاب Power and Interdependence میں اس امر کی تفصیل بیان کی ہے کہ پیچیدہ باہمی انحصار (complex interdependence) کس طرح کام کرتا ہے۔

ان کے مطابق افراد، گروہ اور ریاستیں سیاسی، اقتصادی اور سماجی تعلقات کے ایک ایسے جال میں باہم منسلک ہیں جو متعدد ذرائع اور رابطوں کے ذریعے قائم ہوتا ہے، اور اس کے نتیجے میں پیچیدہ باہمی انحصار کی ایک صورتِ حال پیدا ہوتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس صورتِ حال کے نتیجے میں فوجی تعلقات کی اہمیت کم ہو جائے گی، جبکہ تنازع کے اخراجات بہت زیادہ بڑھ جائیں گے۔

نظامِ ضوابط کا نظریہ (Regime Theory)

اس سے متعلق ایک اور تصور نظامِ ضوابط کا نظریہ (Regime Theory) ہے، جو بنیادی طور پر ایسے سماجی اداروں پر توجہ مرکوز کرتا ہے جو رسمی اور غیر رسمی اصولوں اور معاہدوں کے ذریعے بین الاقوامی تعاون کے مخصوص شعبوں کو منظم کرتے ہیں۔ ان نظاموں کو ایسے مخصوص انتظامات کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو عملی سرگرمیوں کے ایک وسیع دائرے کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان میں اسلحے کے کنٹرول اور ماہی گیری کے معاہدوں سے لے کر ماحولیاتی پالیسی کے مخصوص پہلوؤں، مثلاً جنگلات کی کٹائی کی روک تھام یا کیڑے مار ادویات کے استعمال، تک کے معاملات شامل ہو سکتے ہیں۔

جیسا کہ ینگ (Young, 1989) نے استدلال کیا ہے، یہ امر بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ آیا ریاستیں اجتماعی مسائل کے حل کے لیے عالمی سطح پر باہمی تعاون پر آمادہ ہیں یا نہیں۔

عالمی حکومت یا عالمی سطح پر عوامی اختیارات استعمال کرنے والی دیگر اقسام کی تنظیموں کے مقابلے میں ایسے نظاموں کا قیام نسبتاً آسان ہے۔ بعض نظام پوری دنیا کا احاطہ کرتے ہیں، جبکہ بعض صرف نسبتاً چھوٹے جغرافیائی علاقوں تک محدود ہوتے ہیں۔ کچھ نظاموں میں صرف دو یا تین ارکان ہوتے ہیں، جبکہ دیگر میں ارکان کی تعداد بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔ بعض اوقات ان کے ارکان صرف ریاستوں پر مشتمل ہوتے ہیں، جبکہ بعض دیگر صورتوں میں غیر ریاستی فاعلین (non-state actors) بھی ان میں شامل ہوتے ہیں۔

اس نظریے کے حامیوں کا استدلال ہے کہ یہ نظام بین الاقوامی ماحول کو زیادہ قابلِ پیش گوئی اور کم انتشار پذیر (anarchic) بناتے ہیں۔ کلاسیکی لبرلز کو ایسے اصولوں اور معاہدوں، یا مختلف نوعیت کے متعدد ذرائع اور راستوں کے ذریعے ان کے از خود تشکیل پانے پر کوئی اعتراض نہیں، بشرطیکہ ان کے نتیجے میں انفرادی آزادی کو فروغ ملے اور یہ ایسی 'اوپر سے مسلط کردہ (top-

(down) بین الاقوامی تنظیموں کی صورت اختیار نہ کریں جو افراد یا ریاستی حکومتوں پر جبر مسلط کرنے کی کوشش کریں۔

پیوند شدہ/سرایت لبرل ازم (Embedded Liberalism)

لبرل ادارہ جاتی نظریے کی ایک اور شکل رَگی (Ruggie, 1982) کا 'پیوند شدہ/سرایت لبرل ازم (embedded liberalism) ' ہے۔اس نظریے کے مطابق، دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکہ کی قیادت میں قائم ہونے والے بین الاقوامی نظام میں لبرل ازم کو بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور عالمی بینک جیسی بین الاقوامی تنظیموں کے ذریعے محفوظ بنایا گیا۔
یہ ادارے ایسے داخلی انتظامات کے اندر ''پیوند'' کیے گئے تھے جہاں یہ تصور کیا جاتا تھا کہ ریاستیں فلاحی ریاست اور دیگر سماجی انتظامات جیسی مداخلتوں کے ذریعے لیزے فیئر پر مبنی بین الاقوامی معاشی نظام کے مبینہ سخت اثرات کو ''نرم'' کر سکتی ہیں۔رَگی کو خدشہ تھا کہ عالمگیریت اور اس کے نتیجے میں ریاستوں کے درمیان پیدا ہونے والے بین الاقوامی پالیسی مسابقت کے باعث ریاستیں لبرل ازم کو اس طرح پیوند کرنے اور اس کے اثرات کو متوازن رکھنے کی اپنی صلاحیت مسلسل کھوتی جائیں گی۔
رَگی کے دعووں کی تجرباتی صحت، تاہم، قابلِ سوال ہے۔ جس لیزے فیئر معاشی نظام کو وہ فرض کرتے ہیں، وہ عملاً کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ درحقیقت، کووڈ وبا سے پہلے بہت سے ممالک میں ریاستی شعبہ مجموعی ملکی پیداوار (GDP) کا 40 سے 50 فیصد تک تھا۔مزید برآں، جن اقدامات کو مبینہ طور پر معاشی نظام کے ''سخت اثرات کو نرم'' کرنے کے لیے اختیار کیا گیا، ان میں سے بہت سے اقدامات نے بظاہر انفرادی آزادی اور خوش حالی کو نقصان ہی پہنچایا ہے، (دیکھیے (Bernstein and Pauly, 2007۔

عالمی بینک یقیناً کوئی کلاسیکی لبرل ادارہ نہیں ہے، بلکہ اجتماعی نظریات پر مبنی ترقیاتی امداد کی ایک بیوروکریسی ہے۔ اسی طرح، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ نے بہت سی غیر لبرل ریاستوں اور ان کی اشرافیہ کو بھی اقتدار میں برقرار رہنے میں مدد دی، اگرچہ آخری چارۂ کار کے قرض دہندہ کی حیثیت سے اس کے قرضوں کے ساتھ مبینہ طور پر ''سخت شرائط'' وابستہ رہی ہیں۔
چنانچہ کلاسیکی لبرلز 'پیوند شدہ/سرایت لبرل ازم ' کی تجرباتی بنیاد اور اس امر، دونوں پر سوال اٹھائیں گے کہ یہ نظریہ بہر حال کس حد تک لبرل تھا۔

لبرل امن کا نظریہ (Liberal Peace Theory)

گزشتہ چند دہائیوں کے دوران بین الاقوامی تعلقات کے نظریے میں ہونے والی اہم بحثوں میں سے ایک یہ رہی ہے کہ کیا جمہوری ریاستیں ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کرتی ہیں یا نہیں۔ یہ بحث بھی ان نظریہ دانوں کی فکر سے جڑی ہوئی ہے جو بین الاقوامی نظم اور امن کے لیے داخلی انتظامات کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔
اگرچہ اس سوال پر کوئی حتمی فیصلہ سامنے نہیں آیا، تاہم دوسری جنگِ عظیم کے بعد متعدد ترقی یافتہ ممالک کے درمیان قائم رہنے والے امن کے حوالے سے مضبوط تجرباتی شواہد موجود ہیں (Brown et al, 1996)۔
یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ جمہوری امن کو اکثر 'لبرل امن (liberal peace) ' کہا جاتا ہے، مبینہ طور پر اس لیے کہ متعلقہ ممالک میں لبرل ازم موجود ہے۔ اووین (Owen, 1997) اور میک ملن (MacMillan, 1998) اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ وہ ''لبرل'' کی اصطلاح نسبتاً ڈھیلے انداز میں استعمال کرتے ہیں اور اس سے مراد لبرل خصوصیات کی ایک محدود تعداد لیتے ہیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ لبرل فکر کے ایک مفکر اکثر امانوئل کانٹ (Kant) کو لبرل فکر کے معیار کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور ان کی کتاب (1795) Perpetual Peace کے نسبتاً ناقص مطالعے کی بنیاد پر 'جمہوری امن (republican peace) ' کا تصور پیش کیا جاتا ہے۔ اس عمل میں کانٹ کے دیگر خیالات کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے اور ایسے شواہد کو بھی نظرانداز کیا جاتا ہے جو کانٹ کو لبرل فکر کے معیاری نمائندے کے طور پر پیش کرنے پر سوال اٹھاتے ہیں۔ مولائے (Molloy، 2017) کی کتاب Kant's International Relations اس حوالے سے ایک عمدہ تنقیدی جائزہ پیش کرتی ہے۔

بلاشبہ، لبرل امن کے نظریے میں 'لبرل ازم' کی اصطلاح اکثر بہت وسیع اور غیر واضح مفہوم میں استعمال ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس میں شامل تمام عناصر یا خیالات غیر لبرل ہیں، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ منتخب کیے گئے لبرل نظریات لبرل ازم کی ایک مکمل اور کافی تصویر پیش نہیں کرتے۔ بہت سے کلاسیکی لبرلز جمہوری امن کے نظریے کے بارے میں شکوک رکھتے ہیں، کیونکہ اس کی بنیاد انسانی فطرت کے بارے میں ایک پُرامید تصور، داخلی انتظامات کی اس صلاحیت پر یقین کہ وہ بین الاقوامی نظام کی بنیادی خصوصیات پر قابو پا سکتے ہیں، اور تجارت و دیگر پالیسیوں کے امن کو فروغ دینے والے اثرات پر رکھی گئی ہے۔

گزشتہ چند دہائیوں میں ہونے والی وسیع تحقیق کے باوجود، جمہوری امن یا لبرل امن کے نظریے کی اب تک کوئی ایسی مضبوط اور قابلِ اعتماد وضاحت سامنے نہیں آئی جو اس رجحان کی مکمل توجیہ کر سکے۔

جیسا کہ حصہ دوم میں ذکر کیا گیا ہے، یہی بات 'سرمایہ دارانہ امن (capitalist peace) ' کے تصور پر بھی صادق آتی ہے، جو بین الاقوامی تعلقات کے علمی لٹریچر میں اب بھی ایک زیرِ بحث موضوع ہے (مثلاً Mansfield, 1994; Barbieri, 2005;

Mansfield, and Pollins, 2003; Schneider and Gleditsch, 2013; Copeland, 2015)۔

بعض مصنفین اس معاصر بحث میں تاریخی خیالات کو استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ 'کلاسیکی لبرل خیالات' پیش کر رہے ہیں۔ گارٹزکے (Gartzke) اپنے بااثر مضمون 'The Capitalist Peace' (2007) میں متعدد مفکرین کا تعارف کراتے ہیں، تاہم ان میں سے کئی کو اس کتاب میں زیرِ بحث کلاسیکی لبرل فکر کے بانیوں میں شمار کرنا مشکل ہے۔

مثال کے طور پر، ان کی توجہ کوبڈن (Cobden) پر تو ہے، لیکن ساتھ ہی مل (Mill) پر بھی ہے، جو بنیادی طور پر ایک سماجی لبرل تھے۔ اسی طرح وہ ایسے مفکرین کو بھی شامل کرتے ہیں جن کی کلاسیکی لبرل فکر سے کوئی واضح نسبت نہیں تھی، مثلاً روسو (Rousseau)، بینتھم (Bentham) اور نارمن اینجل (Norman Angell)۔

میک ڈونلڈ (McDonald, 2009) کا معاملہ بھی زیادہ مختلف نہیں۔ وہ بھی تاریخِ افکار میں سے اپنی ضرورت کے مطابق خیالات منتخب کرتے ہیں اور کبھی کبھار کسی کلاسیکی لبرل تصور تک پہنچ جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کا تجزیہ کسی مضبوط اور مربوط علمی بنیاد سے محروم ہے۔

دیگر لبرل ازم

جس طرح سیاسی فلسفے میں لبرل ازم کی متعدد مختلف صورتیں موجود ہیں، مثلاً فطری قانون پر مبنی لبرل ازم (natural law liberalism)، معاشی لبرل ازم (economic liberalism)، ترقی پسند لبرل ازم (progressive liberalism) وغیرہ، اسی طرح بین الاقوامی تعلقات کے نظریہ دان بھی ''لبرل ازم'' کے ساتھ مختلف صفات جوڑ کر اس کی

متعدد اقسام بیان کرتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے نام دراصل پہلے سے موجود لبرل خیالات اور نظریات کو نئے نام دینے یا ان میں معمولی تبدیلیاں کرنے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اکثر یہ 'ایجاد کردہ لبرل ازم (invented liberalisms) 'ہوتے ہیں، یعنی ایسے تصورات جن میں مصنف اپنی طرف سے لبرل ازم کی ایک نئی صورت متعارف کرانے کی خواہش سے خود کو روک نہیں پاتا۔ یہاں ہم ان سب کو مجموعی طور پر 'دیگر لبرل ازم 'کہیں گے۔

مائیکل ڈوئل (Michael Doyle) اور رابرٹ کیوہین (Robert Keohane) موجودہ لبرل نظریات کو نئے نام دینے یا نئے انداز میں پیش کرنے کے حوالے سے خاصے بااثر رہے ہیں۔ ہم پہلے ہی تجارتی امن پسندی(commercial pacifism) ، جسے بعض اوقات تجارتی لبرل ازم (commercial liberalism) بھی کہا جاتا ہے، اور جمہوریہ پسند لبرل ازم (republican liberalism) کا ذکر کر چکے ہیں۔

سماجیاتی لبرل ازم (sociological liberalism) سے مراد بین الاقوامی سرحدوں سے ماورا باہمی روابط اور انضمام کی وضاحت ہے، جو بڑی حد تک فنکشنل ازم سے مشابہ ہے۔ اسی طرح باہمی انحصاری لبرل ازم (interdependence liberalism) بھی فنکشنل ازم اور لبرل ادارہ جاتی نظریے ہی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

کیوہین نے 'پیچیدہ لبرل ازم (sophisticated liberalism) 'کی اصطلاح بھی متعارف کرائی، جو تجارتی لبرل ازم اور جمہوریہ پسند لبرل ازم کا امتزاج ہے۔

زاکر اور میتھیو(Zacher and Matthew ،1995) نے لبرل ازم کی کچھ مزید اقسام تجویز کی ہیں۔ ان میں فوجی لبرل ازم (military liberalism) شامل ہے، جو جدید فوجی ٹیکنالوجی کی تباہ کن طاقت کے باعث امن میں باہمی مفاد کے تصور پر مبنی ہے۔ اسی طرح ادراکی لبرل ازم (cognitive liberalism) اس خیال پر قائم ہے کہ عقلی رویہ اور علم میں اضافہ بین الاقوامی تعلقات کو زیادہ پُرامن بنانے کا باعث بنتا ہے۔

امریکی خارجہ پالیسی میں 'لبرل بالادستی (liberal hegemony)' کے ہدف پر تنقید کرتے ہوئے میئرشائمر (Mearsheimer) نے "ترقی پسند لبرل ازم' (progressive liberalism)اور 'مفاہمتی لبرل ازم (modus vivendi liberalism)' کے درمیان بحث یا کشمکش کا ذکر کیا ہے(Sinha, 2017)۔ اول الذکر حکومت کی مداخلت کا تقاضا کرتا ہے، جبکہ ثانی الذکر کا مؤقف ہے کہ حقوق کا مطلب حکومت کی مداخلت کے بغیر عمل کرنے کی آزادی ہے۔ یہ فرق بڑی حد تک کلاسیکی لبرل ازم اور سماجی لبرل ازم کے درمیان فرق سے مشابہ ہے۔

رینجر(Rengger, 2013)،ڈسٹوپین لبرل ازم (dystopic liberalism) کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، یایوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ رالز کی Theory of Justice کے پیچھے کارفرما لبرل صورت ہے، جسے سماجی لبرل ازم کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

گرفِتھس(Griffiths, 2011) نے اس بحث کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔ان کے مطابق لبرل بین الاقوامیت کے تین بنیادی ستون ہیں : جمہوریہ پسند لبرل ازم، تجارتی لبرل ازم اور ضابطہ جاتی لبرل ازم(regulatory liberalism) ۔ یہ تینوں بڑی حد تک ان خصوصیات سے مطابقت رکھتے ہیں جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

جمہوریہ پسند لبرل ازم جمہوریت کے فروغ سے متعلق ہے اور اس تصور پر مبنی ہے کہ ترقی یافتہ جمہوریتیں ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہیں کرتیں۔ تجارتی لبرل ازم دراصل ""تجارت امن کا باعث بنتی ہے"" کے نظریے کی تکرار ہے، جبکہ ضابطہ جاتی لبرل ازم در حقیقت ضابطہ بندی سے کم اور بین الاقوامی قواعد واصولوں سے زیادہ متعلق ہے۔

اس میں کچھ مستثنیات بھی ہیں۔ رچرڈسن (Richardson, 2001) بظاہر بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں سماجی اور کلاسیکی لبرل خیالات کے درمیان فرق کو سمجھتے ہیں، اگرچہ کلاسیکی لبرل صورت کے بارے میں ان کی ناگواری کے لیے کوئی مضبوط دلیل پیش نہیں کی گئی۔ ڈوئل

(Doyle, 1996) اپنی دیگر تحریروں میں خارجہ پالیسی کے حوالے سے لبرل ازم کی مختلف صورتوں کے درمیان فرق کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ نشاندہی کرتے ہیں کہ کلاسیکی لبرل ازم طاقت کی سیاست کی طرف مائل ہے، جبکہ سماجی لبرل ازم امن پسند عالمی انصاف کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔

یہ مصنفین پھر بھی ایک جزوی تجزیہ پیش کرتے ہیں، لیکن کم از کم وہ اپنے قارئین کو لبرل فکر کا کچھ گہرا اور نسبتاً تفصیلی تجزیہ ضرور فراہم کرتے ہیں۔

مختصراً موجودہ بین الاقوامی تعلقات کے نظریے میں پائی جانے والی مختلف لبرل ازم کی صورتوں میں مشترک خصوصیت یہ ہے کہ وہ بڑی حد تک پُرامید ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ مفادات کی ہم آہنگی اور بین الاقوامی تعاون کے ذریعے دنیا کو ایک بہتر اور زیادہ پُرامن جگہ بنایا جاسکتا ہے، جس کے نتیجے میں جنگ اور تنازع میں کمی آئے گی۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے بین الاقوامی تنظیموں، بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی نظامِ ضوابط کو فروغ دیا جاتا ہے۔ لبرلز داخلی سیاست کی نوعیت کو تبدیل کرنے پر بھی توجہ دیتے ہیں، جس کے لیے وہ عوامی رائے کی قوت کو اہم سمجھتے ہیں اور عوامی رائے کو بنیادی طور پر پُرامن تصور کرتے ہیں۔ یہ گرم جوش، بلکہ تقریباً مثالی نوعیت کے تصورات کلاسیکی لبرل نظریۂ بین الاقوامی تعلقات میں موجود نہیں ہیں، جیسا کہ ہم نے گزشتہ حصے میں دیکھا اور جیسا کہ اگلا باب ایک بار پھر نہایت واضح طور پر بیان کرے گا۔

گیارہواں باب

کلاسیکی لبرل ازم، بین الاقوامی تعلقات کا نظریہ اور خارجہ پالیسی

چونکہ عصرِ حاضر کے بیشتر لبرل نظریاتِ بین الاقوامی تعلقات کلاسیکی لبرل خیالات سے مختلف ہیں، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بین الاقوامی تعلقات کے وسیع تر نظریاتی فریم ورک میں کلاسیکی لبرل نظریۂ بین الاقوامی تعلقات کو کس طرح دیکھا جائے؟ کلاسیکی لبرل ازم محض ایک ایسا فلسفیانہ زاویۂ نظر نہیں ہے جس کے ذریعے بین الاقوامی تعلقات کو سمجھا جائے، بلکہ یہ ایک معیاری نظریہ (normative theory) بھی ہے۔ یعنی یہ اس بات کی وضاحت بھی کرتا ہے کہ کلاسیکی لبرلز عالمی سیاست کو کس طرح دیکھتے ہیں اور بین الاقوامی سیاست کو کس انداز میں چلایا جانا چاہیے۔
یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے کلاسیکی لبرل خارجہ پالیسی کے چند عمومی اصولوں کا جائزہ لیا جائے گا۔

کلاسیکی لبرل نظریہ بمقابلہ لبرل نظریۂ بین الاقوامی تعلقات

گزشتہ ابواب میں کلاسیکی لبرل نظریۂ بین الاقوامی تعلقات اور دوسرے لبرل نظریاتِ بین الاقوامی تعلقات کے درمیان فرق کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان اختلافات کا خلاصہ جدول 4 میں پیش کیا گیا ہے۔

کلاسیکی لبرل ازم اور موجودہ لبرل نظریاتِ بین الاقوامی تعلقات کے درمیان یہ اختلافات کم از کم اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ بین الاقوامی تعلقات کے موضوع پر لبرل فکر کے اندر مزید وسیع بحث و مباحثے کی ضرورت ہے، بالکل اسی طرح جیسے داخلی سیاست کے بارے میں لبرلز کے درمیان بحث جاری رہتی ہے۔ تاہم، اس کے لیے علمی حلقوں اور خارجہ پالیسی کے میدان میں ایک مخصوص اور واضح کلاسیکی لبرل نظریۂ بین الاقوامی تعلقات کو تسلیم کرنا بھی ضروری ہوگا۔

جدول 4: لبرل اور کلاسیکی لبرل نظریۂ بین الاقوامی تعلقات میں فرق

کلاسیکی لبرل نظریۂ بین الاقوامی تعلقات	لبرل نظریاتِ بین الاقوامی تعلقات
تنازع اور جنگ کو بین الاقوامی تعلقات کی مستقل خصوصیات سمجھا جاتا ہے، جس کی بنیاد انسانی فطرت کے بارے میں ایک حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر پر ہے۔	عالمی امن کا حصول ممکن ہے، کیونکہ انسانوں کو اتنا عقلی سمجھا جاتا ہے کہ وہ جنگ اور تنازع پر قابو پا سکتے ہیں۔
قوم کو بین الاقوامی تعلقات کا بنیادی اور فطری فاعل سمجھا جاتا ہے۔	قوم کو عالمی معاملات میں ایک مسئلہ بننے والے فاعل کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔
طاقت کا توازن ایک خود بخود پیدا ہونے والا نظام ساز طریقۂ کار ہے جو بین الاقوامی نظم کو فروغ دیتا ہے۔	طاقت کا توازن ایک مسئلہ اور جنگ کا سبب سمجھا جاتا ہے۔
دیگر داخلی فاعلین، مثلاً سفارت کاروں، مفاداتی گروہوں، این جی اوز، عوامی رائے	دیگر فاعلین، مثلاً مبینہ ''جنگ پسند'' سفارت کاروں، مفاداتی گروہوں اور نام نہاد فوجی صنعتی

اور دیگر عناصر کے کردار کے بارے میں غیر جانب دارانہ نقطۂ نظر اختیار کیا جاتا ہے۔	کمپلیکس کے اثر و رسوخ کو محدود کرنے کی ضرورت ہے۔
صرف کلاسیکی انسانی حقوق کا تحفظ ضروری ہے۔	انسانی حقوق کے مکمل مجموعے کا تحفظ ضروری ہے۔
اس امر کے بارے میں شکوک پائے جاتے ہیں کہ داخلی انتظامات تنازع اور جنگ پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔	داخلی ادارہ جاتی انتظامات، بالخصوص جمہوریت، پُرامن بین الاقوامی تعلقات کو فروغ دے سکتے ہیں (جمہوری امن کا نظریہ)۔
بین الاقوامی قانون، نظامِ ضوابط اور بین الحکومتی تنظیموں کا کردار اہم ہے، لیکن اسے محدود اور زیادہ تر عملی نوعیت کا ہونا چاہیے، کیونکہ یہ انفرادی آزادی کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔	بین الحکومتی اور غیر سرکاری تنظیموں، بین الاقوامی نظامِ ضوابط اور بین الاقوامی قانون کا اہم کردار ہے، کیونکہ ان کا مقصد طاقت کی سیاست کے منطق پر قابو پانا یا اس کے اثرات کو غیر مؤثر بنانا ہے۔
بین الاقوامی تجارت لازماً امن کا باعث نہیں بنتی، اگرچہ یہ بذاتِ خود نہایت مثبت ہے اور اچھے تعلقات کو فروغ دے سکتی ہے۔	توقع کی جاتی ہے کہ بین الاقوامی تجارت امن کو فروغ دے گی۔
فوجی مداخلت صرف غیر معمولی حالات، مثلاً نسل کشی، میں قابلِ قبول ہے۔ جمہوریت کے فروغ کے منصوبوں کی کامیابی پر یقین نہیں کیا جاتا۔	فوجی مداخلت کی نسبتاً وسیع حمایت کی جاتی ہے، خصوصاً جمہوریت کے فروغ کے لیے۔

کلاسیکی لبرل ازم اور بین الاقوامی تعلقات کا انگریزی مکتب

اب تک کلاسیکی لبرل ازم کا موازنہ دیگر لبرل نظریاتِ بین الاقوامی تعلقات اور حقیقت پسندی سے کیا گیا ہے۔ اگرچہ کلاسیکی لبرل ازم اور بین الاقوامی تعلقات کے دیگر نظریات کا باہمی موازنہ دلچسپ ہے، لیکن یہ واضح ہے کہ کلاسیکی لبرلز مارکسزم، تنقیدی نظریہ (Critical Theory) ، تعمیر پسندی (Constructivism) یا سبز نظریہ (Green Theory) جیسے نظریاتِ بین الاقوامی تعلقات سے اختلاف رکھتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں زیادہ امید افزا امر یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ کلاسیکی لبرل ازم کا بین الاقوامی تعلقات کے انگریزی مکتب (English School of International Relations) کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ یہ مکتب دوسری جنگِ عظیم کے بعد کی دہائیوں میں ہیڈلی بُل (Hedley Bull) ، مارٹن وائٹ (Martin Wight) ، ہربرٹ بٹر فیلڈ (Herbert Butterfield)، ایڈم واٹسن (Adam Watson) اور برطانوی کمیٹی برائے نظریۂ بین الاقوامی سیاست (British Committee on the Theory of International Politics) کے دیگر ارکان نے تشکیل دیا۔

گزشتہ تقریباً بیس برسوں کے دوران انگریزی مکتب کا نظریہ زیادہ بااثر ہوا ہے اور اب اسے اکثر بین الاقوامی تعلقات کے نظریے کے کورسز کا حصہ بنایا جاتا ہے۔ انگریزی مکتب کو بعض اوقات گروشیائی (Grotian) یا بین الاقوامی معاشرے کے نقطۂ نظر (international society approach) کے ساتھ بھی مترادف سمجھا جاتا ہے۔

ابتدائی طور پر انگریزی مکتب کی جدت اس بات پر زور دینے میں تھی کہ بین الاقوامی معاشرہ اُس دور کے دو غالب نظریاتی نمونوں —— حقیقت پسندی اور لبرل ازم —— کے درمیان ایک درمیانی راستہ فراہم کرتا ہے۔ لنک لیٹر اور سوگنامی (Linklater and Suganami, 2006) نے

نشاندہی کی ہے کہ ریاستوں کا معاشرہ، ریاستوں کے محض نظام کی صورتِ حال سے ایک پیش رفت کی نمائندگی کرتا ہے، جس کی وضاحت آگے کی جائے گی۔

انگریزی مکتب کے نظریے کی ایک اور خصوصیت عالمی سیاست کے تجزیے کے لیے بین الاقوامی تعلقات کے نظریے کی تین روایات کا استعمال ہے(Wight ، 1991)۔ان تین روایات کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے:

- ہابزی، گروشیائی، کانٹیائی(Hobbesian, Grotian, Kantian)
- حقیقت پسندی، عقلیت پسندی، انقلاب پسندی (Realism, Rationalism, Revolutionism)
- بین الاقوامی نظام، بین الاقوامی معاشرہ، عالمی معاشرہ (International System, International Society, World Society)

یہ روایات طریقۂ کار کے لحاظ سے مفید رہنما تصورات ہیں، لیکن جیسا کہ وائٹ نے کہا، انہیں ''لا متناہی سفر میں ایک دوسرے کے متوازی چلنے والی ریلوے پٹڑیوں '' کے طور پر نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ان کے درمیان کچھ باہمی اشتراک موجود ہے اور تمام خیالات کو کسی ایک عنوان کے تحت پوری طرح سمیٹنا ممکن نہیں۔

اگرچہ ہابزی، گروشیائی اور کانٹیائی اصطلاحات بظاہر پرکشش ہیں، لیکن بعد میں یہ محسوس کیا گیا کہ یہ تقسیم پوری طرح موزوں نہیں، کیونکہ ان تینوں روایات میں شامل خیالات لازماً ان تین مفکرین کے اپنے خیالات سے مطابقت نہیں رکھتے۔درحقیقت،ان کے باہمی اختلافات پر ایک پورا ذیلی علمی لٹریچر موجود ہے، جس کی طرف وائٹ (1991) نے خود ان روایات کا تعارف کراتے ہوئے اشارہ کیا تھا۔

اسی طرح حقیقت پسندی (realism) اگرچہ ایک قابل فہم اصطلاح ہے، لیکن عقلیت پسندی (rationalism)اور انقلاب پسندی (revolutionism) بھی مکمل طور پر اطمینان

بخش اصطلاحات نہیں، کیونکہ یہ بھی ان خیالات کے حقیقی مندرجات سے پوری طرح مطابقت نہیں رکھتیں جنہیں ان سے منسوب کیا جاتا ہے۔
چنانچہ یہاں بین الاقوامی نظام، بین الاقوامی معاشرے اور عالمی معاشرے کے درمیان امتیاز کو استعمال کیا جائے گا۔ تاہم، یہ اصطلاحات بھی لازماً مکمل طور پر جداگانہ روایات کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ انہیں بہتر طور پر ایسے چند مشترک فکری دھاروں کے سادہ مجموعوں کے طور پر سمجھنا چاہیے جو طویل عرصے کے دوران متعدد نظریہ دانوں کی تحریروں میں سامنے آئے ہیں۔
اب آیئے دیکھتے ہیں کہ ان میں سے کون سی روایت کلاسیکی لبرل ازم کے ساتھ سب سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔

عالمی معاشرے کی روایت (World Society Tradition)

عالمی معاشرے کی روایت ان خیالات کو یکجا کرتی ہے جو ریاستوں پر مبنی موجودہ عالمی نظام کو کسی نہ کسی شکل کی عالمی برادری میں انقلابی طور پر تبدیل کرنے کی وکالت کرتے ہیں۔ بوزان (Buzan, 2014) وضاحت کرتے ہیں کہ وائٹ (Wight) نے ابتدا میں اس روایت کے تحت ایک ایسے متنوع گروہ کو شامل کیا تھا جس میں انارکسٹ، کمیونسٹ اور لبرلز سب شامل تھے۔
تاہم، گزشتہ چند دہائیوں کے دوران یہ روایت بڑی حد تک ان بیشتر لبرل نظریاتِ بین الاقوامی تعلقات کے مترادف بن گئی ہے جن کا ذکر باب 10 میں کیا گیا ہے۔
بین الاقوامی تعلقات میں 'عالمی معاشرے' کو ایک اعلیٰ ترین اخلاقی مقصد کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس تصور میں عالمی معاملات میں عمل کے بنیادی محرک کے طور پر طاقت کی جگہ اخلاقیات کو قائم

کرنے کی کوشش شامل ہے۔ اس نظریے کے پیروکار افراد اور گروہوں کے مفادات کے درمیان ہم آہنگی کے امکان پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔

یہ روایت ریاستوں کے مرکزی کردار کو کم کرنے اور ان کی جگہ بین الاقوامی قانون پر مبنی بین الاقوامی و بین ریاستی تنظیموں، یا حتیٰ کہ وفاقوں کے قیام پر زور دیتی ہے۔

ان تمام نکات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہے کہ کلاسیکی لبرل ازم 'عالمی معاشرے کی روایت' میں فٹ نہیں بیٹھتا۔

بین الاقوامی نظام کی روایت (International System Tradition)

کلاسیکی لبرل ازم کا بین الاقوامی نظام کی روایت سے موازنہ کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس روایت کو اکثر حقیقت پسندی (Realism) کے ساتھ مترادف سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اس کے مطابق بین الاقوامی سیاست طاقت کے حصول کے لیے جاری رہنے والی مسلسل کشمکش ہے۔ اقوامِ متحدہ اور دیگر بین الاقوامی تنظیموں کے وجود کے باوجود یہ تصور کیا جاتا ہے کہ خود مختار ریاستوں سے بالاتر کوئی اعلیٰ اختیار موجود نہیں۔ چنانچہ ریاستیں ایک انارکی کی صورتِ حال میں رہتی ہیں، جہاں ایک بنیادی سلامتی کا مخمصہ (security dilemma) موجود ہوتا ہے۔ بین الاقوامی سیاست کو طاقت کے حصول کے لیے صفر جمعی (zero-sum) کشمکش سمجھا جاتا ہے؛ یعنی ایک ریاست کا فائدہ دوسری ریاست کے نقصان پر حاصل ہوتا ہے، کیونکہ ان کے مفادات کو باہم متضاد تصور کیا جاتا ہے۔ حقیقت پسند انسانی فطرت کو خود غرض سمجھتے ہیں اور عالمی سیاست میں اخلاقی تحفظات یا ریاستوں کے رویے کی رہنمائی کرنے والے بین الاقوامی قانونی انتظامات کے لیے حقیقی گنجائش نہیں دیکھتے۔ اگرچہ ایسے انتظامات موجود ہیں، لیکن یہ سمجھا جاتا ہے کہ ریاستیں ان میں اسی وقت تک شریک رہتی ہیں جب تک یہ ان کے قومی مفادات کے مطابق ہوں۔ تاہم،

—raison d'état یعنی ریاستی مفاد کا تقاضا— اکثر بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی تنظیموں کو نظر انداز کرنے کے جواز کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

حقیقت پسندی کی متعدد شاخیں ہیں۔ بنیادی ترین تقسیم کلاسیکی حقیقت پسندی اور نیو حقیقت پسندی کے درمیان ہے۔ کلاسیکی حقیقت پسندی کا تعلق تھیوسی ڈائڈیز (Thucydides)، میکیاولی (Machiavelli)، ہابز (Hobbes)، ژاں ژاک روسو (Jean-Jacques Rousseau) اور میکس ویبر (Max Weber) جیسے مفکرین سے جوڑا جاتا ہے، جبکہ نیو حقیقت پسندی کو والٹز (Waltz, 2010) نے ساختی حقیقت پسندی (structural realism) بھی کہا۔ بین الاقوامی نظام کی روایت سے وابستہ جدید مفکرین میں ای۔ ایچ۔ کار (E. H. Carr)، جارج کینن (George Kennan)، رائن ہولڈ نیبُوہر (Reinhold Niebuhr)، ہنری کسنجر (Henry Kissinger) اور ہانس مورگنتھاؤ (Hans Morgenthau) شامل ہیں۔

حقیقت پسندی کا تعلق اکثر قدامت پسندی (conservatism) اور حالیہ برسوں میں نو قدامت پسندی (neoconservatism) سے بھی جوڑا جاتا ہے۔

نیو حقیقت پسندی ان پابندیوں پر زور دیتی ہے جو بین الاقوامی سیاسی نظام فاعلین پر عائد کرتا ہے۔ اس نظریے میں ریاستیں بطور اکائیاں اپنے افعال کے اعتبار سے ایک جیسی ہوتی ہیں، لیکن ان کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ریاستوں کے لیے طاقت کا توازن اختیار کرنا سب سے زیادہ عقلی پالیسی سمجھا جاتا ہے۔

اکثر نیو حقیقت پسندی بین الاقوامی تعلقات کے تجزیے میں قدرتی علوم سے ماخوذ طریقۂ کار اختیار کرتی ہے، مثلاً گیم تھیوری (game theory)، قیدیوں کا مخمصہ (Prisoner's Dilemma)، یا شماریاتی طریقوں اور ڈیٹا سیٹس کے ذریعے مفروضوں کی جانچ۔ معاشی مسائل یا بین الاقوامی تعلقات پر داخلی فاعلین کے ممکنہ اثر و رسوخ کو نسبتاً کم توجہ دی جاتی ہے۔

کلاسیکی لبرل ازم اور حقیقت پسندی میں فرق

بعض قارئین کلاسیکی لبرل ازم اور حقیقت پسندی کے درمیان فرق پر سوال اٹھا سکتے ہیں۔ آخر کار، اب تک بیان کیا گیا کلاسیکی لبرل ازم اور حقیقت پسندی بظاہر کئی خیالات میں اشتراک رکھتے ہیں، مثلاً عالمی سیاست میں قومی ریاست کا مرکزی کردار، طاقت کے توازن کی اہمیت، اور اس بات کا اعتراف کہ جنگ بعض اوقات ناگزیر ہوتی ہے۔ تاہم، یہ صرف تصویر کا ایک حصہ ہے۔

کلاسیکی لبرلز بین الاقوامی نظم کے امکان کے بارے میں حقیقت پسندوں سے زیادہ پُرامید ہیں۔ ان کی بنیادی تشویش ریاست کے مفادات کے بجائے فرد کی آزادی ہے، اور وہ بڑی طاقتوں کے ذریعے عالمی نظم چلانے کے اصول کو قبول کرنے میں بھی حقیقت پسندوں کی نسبت کم آمادہ ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک تمام ریاستوں کی خود مختاری کے حق کا احترام ہونا چاہیے۔

بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی تنظیمیں اگرچہ مفید ہیں، لیکن ان کا دائرہ محدود ہونا چاہیے تاکہ انفرادی آزادی کا تحفظ کیا جا سکے۔ انہیں محض ریاستی مفاد (reasons of state) کی بنیاد پر یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

کلاسیکی لبرلز کے نزدیک عالمی سیاست محض بے لگام انارکی نہیں، بلکہ قومی ریاستوں پر مشتمل ایک انارکی پر مبنی معاشرہ (anarchical society) ہے، جس میں اخلاقی تحفظات اور بعض قواعد، مثلاً وعدے پورے کرنے کا اصول، بھی اپنا مقام رکھتے ہیں۔

کلاسیکی لبرلز انسانی فطرت کے بارے میں ایک حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں، جبکہ حقیقت پسند انسانی فطرت کو زیادہ منفی انداز میں دیکھتے ہیں۔ دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ کلاسیکی لبرلز انسانوں کی سماجی فطرت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس خیال کو رد کرتے ہیں کہ انسان فطری طور پر خود غرض ہوتے ہیں۔

کلاسیکی لبرلز کے نزدیک اقوام کا معاشرہ (society of nations) بین الاقوامی نظم کی سب سے زیادہ مستحکم شکل پیش کرتا ہے، جو بالآخر انفرادی آزادی کو محفوظ بناتا ہے، یا کم از کم ایسے بہترین بین الاقوامی حالات فراہم کرتا ہے جن میں آزادی کا تحفظ ممکن ہو۔ البتہ یہ حقیقت میں فرد کی آزادی کو کس حد تک یقینی بنائے گا، اس کا انحصار داخلی انتظامات پر ہوگا۔

کلاسیکی لبرلز کے لیے دنیا کی سیاست کو اقوام کے ایک انارکی پر مبنی معاشرے کی صورت میں منظم کرنا، ایسی بین الاقوامی صورتِ حال سے بہتر ہے جو محض مکمل انارکی پر مبنی ہو۔ مکمل انارکی پر مبنی بین الاقوامی نظام نسبتاً کم قابلِ پیش گوئی ہوتا ہے اور اس میں کلاسیکی لبرل خیالات کے لیے بھی کم گنجائش ہوتی ہے، مثلاً:

- عالمگیریت؛
- آزاد تجارت؛
- جنگِ عادلانہ (just war) کے اصولوں کے تحت جنگ کی پابندی؛
- مؤثر لیکن محدود بین الاقوامی قانون؛
- عملی نوعیت کی بین الاقوامی تنظیمیں؛
- اور حکومتوں کے درمیان ترقیاتی امداد کا خاتمہ، جو اکثر طاقت کی سیاست کے مقاصد کے تحت تقسیم کی جاتی ہے۔

ہیوم، ہائیک اور حقیقت پسندی

یہ فرق ڈیوڈ ہیوم (Hume) اور ایف۔ اے۔ ہائیک (Hayek) کے کام کے تجزیے میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔

میکیاولی اور ہیوم کے خیالات کے ایک معلوماتی تقابلی مطالعے میں وہیلن(Whelan ، 2004) وضاحت کرتے ہیں کہ ہیوم نے خود کو واضح طور پر میکیاولی کے ان خیالات سے الگ رکھا جن میں فتح اور قومی سرزمین کی توسیع کی حمایت، فوجی فتوحات اور قومی عظمت کے درمیان تعلق، طاقت کے توازن کو برقرار رکھنے کی ضرورت سے آگے بڑھنے والی جنگیں، یا قانونِ اقوام (law of nations)اور جنگِ عادلانہ کے تصورات کو نظر انداز کرنا شامل تھا۔

اسی لیے وہیلن کا نتیجہ ہے کہ:

”ہیوم، ہانس مور گنتھاؤ کی جدید بین الاقوامی حقیقت پسندی کا پیش رو نہیں تھا۔“

اسی طرح ہائیک نے ہابز کے اس تصور کو مسترد کیا کہ بین الاقوامی میدان ”ہر ایک کی ہر ایک کے خلاف جنگ “کی حیثیت رکھتا ہے۔

اپنی کتاب The Road to Serfdom میں ہائیک نے معروف کلاسیکی حقیقت پسند ای۔ایچ۔کار کو بھی اس لیے تنقید کا نشانہ بنایا کہ وہ عالمی سیاست میں اخلاقیات کو ثانوی حیثیت دینے کے خیال سے اختلاف کرتے ہوئے کار کو ”ہم میں موجود مطلق العنانوں میں سے ایک “قرار دیتے ہیں۔

ہائیک نے بین الاقوامی سیاست میں وعدے پورے کرنے کے اصول، یعنی pacta sunt servanda، کو برقرار رکھنے پر زور دیا۔انہوں نے کار کے اس خیال کی بھی مخالفت کی کہ ”جنگ سماجی یکجہتی کا سب سے طاقتور ذریعہ ہے“اور قوم پرستی کو قابو میں رکھنے کی ان کی امید سے بھی اتفاق نہیں کیا(Van de Haar, 2009) ۔

کلاسیکی لبرل ازم بحیثِ (تکثیری) بین الاقوامی معاشرے کا نظریہ

Classical Liberalism as (Pluralist) International Society Theory

کلاسیکی لبرل خیالات بین الاقوامی معاشرے کی روایت (international society tradition) کے ساتھ زیادہ بہتر طور پر مطابقت رکھتے ہیں، جسے انگریزی مکتب (English School) کے نظریے میں ایک درمیانی نقطۂ نظر سمجھا جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، یہ روایت بین الاقوامی تعلقات کا تجزیہ مشترکہ قواعد واداروں اور فطری قانون (natural law) کی بنیاد پر قائم ریاستوں کے ایک معاشرے کے طور پر کرتی ہے۔ بین الاقوامی نظام کی روایت کے برعکس، یہ مؤقف اختیار کرتی ہے کہ ریاستیں مستقل طور پر طاقت کی کشمکش اور جنگ میں مصروف نہیں رہتیں، بلکہ بعض قواعد اور اخلاقی اصول بھی ان کے باہمی تعلقات پر لاگو ہوتے ہیں۔

دوسری طرف، عالمی معاشرے کی روایت کے برعکس، یہ واضح کرتی ہے کہ خود مختار ریاستیں بین الاقوامی تعلقات میں سب سے اہم فاعل ہیں اور مستقبل میں بھی رہیں گی۔

بُل (Bull, 1977) نے متعدد ایسے اداروں پر زور دیا جو عالمی سیاست میں نظم کو فروغ دیتے ہیں، جن میں جنگ، طاقت کا توازن، بین الاقوامی قانون اور سفارت کاری شامل ہیں۔ ان کے نزدیک جنگ ایک ناگزیر برائی تھی جس نے بین الاقوامی معاشرے کی تشکیل میں کردار ادا کیا، جبکہ طاقت کے توازن نے بین الاقوامی نظم کی ایک شکل پیدا کی۔ اس کے علاوہ، وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ بڑی طاقتوں کی بین الاقوامی نظم برقرار رکھنے میں ایک خصوصی ذمہ داری ہے، جس میں بین الاقوامی قانون اور سفارت کاری ان کی معاونت کرتے ہیں۔

بُل نے بین الاقوامی معاشرے کی روایت کو دو دھڑوں میں تقسیم کیا۔ انہوں نے ان ماہرینِ بین الاقوامی معاشرہ کو جو بین الاقوامی نظام کی روایت کی طرف زیادہ مائل تھے، 'تکثیریت پسند' (pluralists) کہا، جبکہ عالمی معاشرے کی روایت کی طرف جھکاؤ رکھنے والوں کو 'یکجہتی پسند' (solidarists) کا نام دیا۔

جیسا کہ بوزان (Buzan، 2004، 2014) وضاحت کرتے ہیں، دونوں کے درمیان بنیادی فرق ان دو تصورات میں ہے:

"نظم اہم معنوں میں انصاف کے لیے ایک پیشگی شرط ہے"، جبکہ دوسرا موقف یہ ہے کہ "انصاف کے بغیر نظم بالآخر پائیدار نہیں رہ سکتا۔"

مائسز (Mises) اور ہائیک (Hayek) اس زمانے میں زندہ تھے جب بُل، وائٹ اور انگریزی مکتب کی پہلی نسل کے دیگر ارکان بین الاقوامی تعلقات کے نظریے پر لکھ رہے تھے۔ تاہم، اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ان کی کبھی ملاقات ہوئی یا وہ ایک دوسرے کے خیالات سے متاثر ہوئے۔ اس کے باوجود، بین الاقوامی سیاست پر لکھنے والے کلاسیکی لبرلز اور تکثیریت پسند بین الاقوامی معاشرے کی روایت کے درمیان واضح فکری ہم آہنگی موجود ہے۔

دونوں دنیا کو ریاستوں کے ایک معاشرے کے طور پر دیکھتے ہیں، جہاں بین الاقوامی تنازع اور جنگ ایک افسوس ناک مگر ناگزیر حقیقت ہیں، جنہیں جنگِ عادلانہ (just war) کے اصولوں کے ذریعے محدود کیا جانا چاہیے۔ دونوں طاقت کے توازن، سفارت کاری، اور محدود پیمانے پر بین الاقوامی قانون و تنظیم کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔

اسی طرح، دونوں کے ہاں گروشیائی (Grotian) تصورِ جنگِ عادلانہ کی براہِ راست پذیرائی بھی ملتی ہے۔

ہیوم (Hume, 1998) نے جنگِ عادلانہ اور اقوام کے بین الاقوامی معاشرے کی حمایت کی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "ہابز کی سیاست صرف ظلم واستبداد کو فروغ دینے کے لیے موزوں ہے،

جبکہ اس کی اخلاقیات بے لگام طرزِ عمل کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ ''ان کے نزدیک فطری حالت (state of nature) محض ایک ''فلسفیانہ افسانہ'' تھی۔

ہیوم کی جانب سے طاقت کے توازن کی حمایت اس بصیرت پر مبنی تھی کہ یہ بین الا قوامی نظم کو فروغ دیتا ہے، جو قواعد کے لیے جگہ پیدا کرتا ہے اور اقوام کو آزادی، خوش حالی اور آزاد تجارت کے ذریعے نسبتاً پُرامن اور محدود سماجی تبدیلی پر زیادہ توجہ دینے کے قابل بناتا ہے۔

اسی طرح، ایڈم اسمتھ (Smith) نے بھی بین الا قوامی معاشرے کی اہمیت، جنگِ عادلانہ کی ضرورت اور فطری قانون کے اصولوں —جیسا کہ گروشیوس کے کام میں ملتے ہیں— کی پابندی پر زور دیا۔ ساتھ ہی وہ طاقت کے توازن، جنگ کی ناگزیریت اور دفاع کی ضرورت کو بھی تسلیم کرتے تھے۔

مائسز نے ہر قسم کی جارحانہ جنگ کو مسترد کیا، ریاستوں کے بین الا قوامی معاشرے کے اداروں کی حمایت کی اور گروشیوس کے جنگ و امن کے نظریے کے بارے میں مثبت رائے رکھی۔ عمومی طور پر ان کا خیال تھا کہ آزاد اقوام کی ایک مشترکہ دولتِ اقوام (commonwealth of free nations) بہترین بین الا قوامی نظم کی تشکیل کرے گی۔

ہائیک (Hayek, 2007) نے مشہور طور پر لکھا کہ بین الا قوامی معاملات کے حوالے سے ان کا مقصد ''نہ ایک ہمہ گیر طاقت رکھنے والی بالادست ریاست، نہ آزاد اقوام کی ڈھیلی ڈھالی انجمن، بلکہ آزاد انسانوں پر مشتمل اقوام کی ایک برادری'' تھا۔

چنانچہ انگریزی مکتب کے فریم ورک میں کلاسیکی لبرل ازم کو تکثیریت پسند بین الا قوامی معاشرے کی روایت (pluralist international society tradition) کا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اسے تکثیریت پسند اس لیے کہا جاتا ہے کہ کلاسیکی لبرلز اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ نظم انفرادی آزادی کے لیے ایک بنیادی پیشگی شرط ہے۔ بین الا قوامی تعلقات کے دیگر لبرل نظریات عالمی

معاشرے کی روایت کے ساتھ زیادہ بہتر مطابقت رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی اتنا ہی اہم ہے کہ کلاسیکی لبرل ازم حقیقت پسندی (realism) کی کوئی شکل نہیں ہے اور نہ ہی یہ عالمی نظام کی روایت (world system tradition) کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔

کلاسیکی لبرل خارجہ پالیسی

نظریے سے عملی اطلاق کی طرف بڑھنا کبھی بھی ایک سیدھا سادہ عمل نہیں ہوتا، اور بین الاقوامی تعلقات کے نظریے سے خارجہ پالیسی کی تشکیل کی طرف منتقلی بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ مزید برآں، یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ خارجہ پالیسیاں شاذ و نادر ہی کسی "خالی صفحے" سے وضع اور نافذ کی جاتی ہیں۔ موجودہ خارجہ پالیسی میں ہونے والی ہر تبدیلی ایک ایسی عالمی صورتِ حال سے شروع ہوتی ہے جس میں ریاستیں پہلے ہی بین الاقوامی سیاسی ماحول میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے ردِ عمل میں اپنی خارجہ پالیسیاں تشکیل دے چکی ہوتی ہیں۔

چنانچہ محض نظریاتی بنیادوں پر ایک حقیقی کلاسیکی لبرل خارجہ پالیسی وضع کرنے کی کوششیں ناکامی سے دوچار ہوں گی۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ کچھ عمومی رہنما اصول یا ضابطۂ کار وضع کیے جائیں جنہیں بعدازاں کسی مخصوص ریاست کے حالات اور ضروریات کے مطابق ڈھالا جا سکے۔

جیسا کہ اگلے باب میں واضح کیا جائے گا، ایسی جامع کلاسیکی لبرل خارجہ پالیسی پیش کرنا جو تمام ممالک پر یکساں طور پر لاگو ہو سکے، عملی طور پر ممکن نہیں۔ اسی لیے امریکی لبرٹیرینز (libertarians) اور کلاسیکی لبرل تھنک ٹینکس کی سفارشات کو، جو بنیادی طور پر امریکی حالات کے لیے وضع کی گئی ہیں، دوسرے ممالک پر منطبق کرنے کی کوشش ایک غلطی ہو گی۔ اکثر اوقات ان کے خیالات دیگر ممالک کی مخصوص خارجہ پالیسی کی ضروریات اور حالات سے مطابقت نہیں رکھتے۔

امریکہ کئی اعتبار سے ایک منفرد مثال، بلکہ ایک استثنا ہے، کیونکہ اس کے پاس غیر معمولی عسکری طاقت، سفارتی اثر و رسوخ اور بین الاقوامی تنظیموں میں حقیقی عالمی موجودگی، دنیا کی سب سے بڑی

معیشتوں میں سے ایک، اور وسیع ثقافتی اثر ورسوخ موجود ہے۔ بیشتر دوسرے ممالک کے پاس یہ تمام خصوصیات نہیں ہیں اور غالباً وہ کبھی بھی اس مقام تک پہنچنے کے قابل نہ ہوں۔

اس کے باوجود، یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ خارجہ پالیسیاں نہ حتمی ہوتی ہیں اور نہ اٹل، کیونکہ خارجہ پالیسی کی سیاست ہمیشہ تبدیلی کے عمل سے عبارت ہوتی ہے(Hill, 2003) ۔ یہ تبدیلی مختلف واقعات کے ردِ عمل میں رونما ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر، روس کی جانب سے یوکرین کے خلاف جنگ نے فن لینڈ اور سویڈن کو اس نتیجے تک پہنچایا کہ اب نیٹو (NATO) کا رکن بننے کا وقت آ گیا ہے۔ اسی طرح تبدیلی وسیع تر عالمی حالات میں بنیادی تبدیلیوں کے ردِ عمل کے طور پر بھی سامنے آسکتی ہے، مثلاً سرد جنگ کا خاتمہ یا موسمیاتی تبدیلی۔

اس کے علاوہ، خارجہ پالیسی میں تبدیلی کا مطالبہ کرنے یا اسے فروغ دینے والے داخلی عوامل بھی موجود ہوتے ہیں۔ ان میں حکومت کی تبدیلی، مختلف وزارتوں اور سرکاری اداروں کا کردار، اور مفاداتی و دباؤ کے گروہ (pressure groups) وغیرہ شامل ہیں۔

لہٰذا، کسی مخصوص ملک کی خارجہ پالیسی میں کلاسیکی لبرل عناصر کا شامل ہونا اندرونی اور بیرونی دونوں طرح کی تبدیلیوں کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ کلاسیکی لبرل خارجہ پالیسی کے بعض اہم عمومی رہنما اصول، جو ہر ممکن پہلو کا احاطہ کرنے کا دعویٰ نہیں کرتے، درج ذیل ہیں:

- قومی اور عالمی سلامتی کسی بھی خارجہ پالیسی کے بنیادی ستون ہیں، کیونکہ تمام ممالک کو ایک سلامتی کے مخمصے (security dilemma) کا سامنا رہتا ہے۔ اس لیے طاقت کے توازن پر مبنی سیاست ضروری ہے، جس میں فوجی اتحادوں میں فعال طور پر شمولیت اختیار کرنا اور ان میں اپنے واجبات ادا کرنا بھی شامل ہے۔ بین الاقوامی نظم انفرادی آزادی کے تحفظ کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔
- جنگ بعض اوقات خارجہ پالیسی کے ایک ذریعے کے طور پر ناگزیر ہو سکتی ہے، لیکن اسے صرف جنگِ عادلانہ (just war) کے اصولوں کے مطابق ہی لڑا جانا چاہیے۔

فوجی مداخلت شاذ و نادر ہی قابل جواز ہوتی ہے اور ویسے بھی اس کی طویل مدتی کامیابی کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ تاہم، اسے ان جائز فوجی کارروائیوں کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیے جن کا مقصد عالمگیر بن چکی دنیا میں نظم و نسق برقرار رکھنا ہو، مثلاً بحری قزاقی کے خلاف سمندری تجارتی راستوں کا تحفظ۔

- سفارت کاری روزمرہ کے بین الحکومتی روابط میں ایک مفید ذریعہ بدستور ہے۔ اس کے علاوہ یہ قونصلر خدمات فراہم کرنے اور اقوام کے درمیان سفر اور تجارت کو ممکن بنانے میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ البتہ اس بات پر بحث کی گنجائش موجود ہے کہ سفارت کاری میں تجارتی فروغ کی سرگرمیاں بھی شامل ہونی چاہییں یا اسے موجودہ تجارتی تعلقات کے تحفظ تک محدود رہنا چاہیے۔ آخرکار، منظم تجارت (managed trade) یا تجارتی پالیسی اپنی نوعیت میں مرکنٹائل ازم (mercantilism) کی حامل ہوتی ہے۔
- شہریوں کا تحفظ اور سرحدوں کا تحفظ ریاست کے بنیادی فرائض میں شامل ہیں۔ تاہم، ایک بار پھر یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ سرحدوں کی کشادگی کے بارے میں کلاسیکی لبرلز کے درمیان مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔
- بین الاقوامی قوانین اور بین الاقوامی تنظیموں کی وسعت، دائرۂ کار، مواد اور تعداد کو کم سے کم رکھا جانا چاہیے، کیونکہ یہ انفرادی آزادی کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ البتہ فعالی نوعیت کے معاہدے (functional agreements) اور نظامِ ضوابط (regimes) یقیناً ممکن بھی ہیں اور مطلوب بھی۔ یہاں بہت سے ”درمیانی یا مبہم معاملات (grey areas)“ پیدا ہوں گے، لیکن بین الاقوامی معاہدوں میں ہمیشہ ایسا شق شامل ہونی چاہیے جو ممالک کو ان سے علیحدہ ہونے کا حق دے۔

- آزاد تجارت کے مزید فروغ کو خارجہ پالیسی کا ایک بنیادی مقصد ہونا چاہیے۔ مثالی صورت یہی ہو گی کہ تجارت میں حکومت کی کسی مداخلت کے بغیر آزادانہ لین دین ہو۔ عالمی تجارتی تنظیم (WTO) ایک ثانوی اور غیر مثالی متبادل ہے، تاہم یہ تنازعات کے حل کا ایک طریقۂ کار فراہم کرتی ہے اور اس کے قواعد و معاہدے تمام رکن ممالک پر لاگو ہوتے ہیں۔ دو طرفہ تجارتی معاہدے قابلِ قبول ہیں، لیکن مقصد یہ ہونا چاہیے کہ انہیں WTO کے ذریعے کثیر الجہتی معاہدوں میں ضم کیا جائے، یا حقیقی آزاد تجارت کے حق میں انہیں مکمل طور پر ختم کر دیا جائے۔
- کلاسیکی لبرلز حکومت سے حکومت کو دی جانے والی ترقیاتی امداد کے بارے میں شکوک و شبہات رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ عالمی بینک اور دیگر سرکاری ترقیاتی امدادی اداروں کو ختم کر دینا چاہیے۔ ہنگامی امداد اس سے مستثنیٰ ہے۔ رضاکارانہ عطیات اور غیر سرکاری تنظیمیں (NGOs) قابلِ قبول ہیں، تاہم کلاسیکی لبرلز این جی اوز کی سرکاری مالی معاونت کی مخالفت کرتے ہیں۔
- اقوام متحدہ (UN) ، بالخصوص اس کی سلامتی کونسل، میں کم از کم اتنی اصلاح ضرور ہونی چاہیے کہ جدید دنیا میں موجود طاقت کے حقیقی توازن کو اس میں ملحوظ رکھا جا سکے۔ یقیناً برطانیہ اور فرانس میں بعض کلاسیکی لبرلز اپنے ممالک کی مستقل رکنیت برقرار رکھنے کی حمایت کو ایک حب الوطنی کا فریضہ سمجھ سکتے ہیں، لیکن وسیع تر عالمی تناظر میں یہ ایک فرسودہ اور زمانے سے پیچھے رہ جانے والی حیثیت (anachronism) ہے۔

اقوام متحدہ بہر حال ایک قابلِ قدر ادارہ ہے: یہ ممالک کو ایک جگہ جمع ہو کر موجودہ عالمی معاملات پر گفتگو کرنے اور تنازعات کو غیر ضروری طور پر شدت اختیار کرنے سے روکنے کی کوشش کا موقع فراہم کرتا ہے۔ تاہم، اس کے بہت سے ذیلی اداروں کو یا تو ختم کیا جا سکتا ہے یا ان کے دائرۂ کار کو ان کے بنیادی کاموں تک محدود کیا جا سکتا ہے، تاکہ وہ سختی سے فعالی (strictly functional)

ادارے بن کر رہیں۔ اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل اپنی موجودہ رکنیت، جس میں آمرانہ حکومتیں اور آمریتیں بھی شامل ہیں، کے باعث ایک واضح بے جوڑ اور غیر معمولی ادارہ (anomaly)بن چکی ہے۔

- علاقائی تعاون بھی قابل ترجیح ہے، بشرطیکہ وہ اس عمومی کلاسیکی لبرل اصول سے ہم آہنگ ہو کہ ریاست کو افراد کی زندگی میں محدود مداخلت کرنی چاہیے۔

بارھواں باب

لبرٹیرینزاور بین الاقوامی تعلقات(IR)

بین الاقوامی تعلقات کے نظریے (IR theory) کی نصابی کتب، علمی جرائداور دیگر مطبوعات میں لبرٹیرین (libertarian) خیالات کی کوئی نمایاں اور منظم پیشکش تلاش کرنا مشکل ہے۔ اگرچہ ایسے لبرٹیرین مفکرین موجود ہیں جنہوں نے بین الاقوامی تعلقات پر لکھا ہے، تاہم ان کے خیالات اکثر مرکزی دھارے کے بین الاقوامی تعلقات کے نظریے سے اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ معاشیات یاسیاسی فلسفے پر لکھنے والے لبرٹیرین مفکرین کے خیالات بھی شاید اتنے مختلف نہ ہوں۔ بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں کلاسیکی لبرل نقطۂ نظر کے برخلاف، بہت سے لبرٹیریز خارجہ امور سے متعلق چند مخصوص موضوعات پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ چنانچہ معروف انارکو-کیپٹلسٹ (anarcho-capitalist)مفکر مرے روتھبارڈ (Murray Rothbard) کا یہ مشاہدہ درست معلوم ہوتا ہے کہ لبرٹیرین فکر میں بین الاقوامی تعلقات، یا بالخصوص جنگ و امن کے مسائل کو اکثر نظرانداز کر دیا جاتا ہے(Rothbard, 2000) ۔

یہ باب بین الاقوامی سیاست کے بارے میں لبرٹیریز کے بعض اہم خیالات کا جائزہ لیتا ہے۔ اس میں ان کے تاریخی ماخذ، کلاسیکی لبرل ازم سے ان کے اختلافات، مخصوص بین الاقوامی مسائل پر ان کے

اطلاق، اور آئن رینڈ (Ayn Rand) کے اہم خیالات کو زیرِ بحث لایا جائے گا۔ چونکہ یہ ایک مختصر جائزہ ہے، اس لیے اسے ایک جامع یا مکمل احاطہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

کلاسیکی لبرل ازم کی طرح لبرٹیرین ازم بھی ایک وسیع اور متنوع فکری روایت ہے۔ درحقیقت، جدید امریکی اصطلاحی استعمال میں کلاسیکی لبرل ازم اور لبرٹیرین ازم کو بعض اوقات ایک دوسرے کا مترادف سمجھا جاتا ہے، اور یہ دونوں اصطلاحات باہم متبادل کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہیں۔ اس صورتِ حال نے دونوں کے درمیان واضح امتیاز قائم کرنا مزید مشکل بنا دیا ہے (ملاحظہ ہو: Van de Haar, 2015)۔

جیسا کہ باب 2 میں بحث کی جا چکی ہے، اس کتاب میں لبرٹیریز سے بنیادی طور پر مراد انارکو-کیپٹلسٹ (anarcho-capitalist) اور مینارکسٹ (minarchist) مفکرین ہیں، یعنی وہ مفکرین جو ریاست کے کردار کو یا تو مکمل طور پر ختم کرنے یا اسے کم سے کم ممکنہ اختیارات تک محدود رکھنے کے حامی ہیں۔

اگرچہ خود کو لبرٹیرین کہنے والے مختلف مصنفین کے خیالات کی درست درجہ بندی اور ان کے درمیان باریک امتیازات کی نشاندہی کرنا مشکل ہے، تاہم اس باب میں پیش کیا جانے والا خاکہ لبرٹیرین نقطۂ نظر کا ایک منصفانہ اور متوازن جائزہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

تاریخی نقوش

انیسویں صدی کے مفکرین، مثلاً کوبڈن (Cobden) اور اسپنسر (Spencer)، کو بعض اوقات ایک مضبوط عالمگیر نقطۂ نظر (cosmopolitan outlook) رکھنے والی لبرٹیرین فکری روایت کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ تاہم، ان کے بعض خیالات کلاسیکی لبرلز کے لیے بھی فکری تحریک کا ذریعہ رہے ہیں۔ رچرڈ کوبڈن (Richard Cobden, 1804-1865) اس حوالے سے ایک نمایاں مثال ہیں۔

جان برائٹ (John Bright) اور اینٹی کارن لا لیگ (Anti–Corn Law League) کے ساتھ مل کر آزاد تجارت کے حق میں کوبڈن کی جدوجہد نے کلاسیکی لبرلز اور لبرٹیرینز، دونوں کو متاثر کیا۔ تاہم، ان کے بعض دیگر خیالات کو کلاسیکی لبرل ازم کے مقابلے میں لبرٹیرین ازم سے جوڑنا زیادہ آسان ہے، بالخصوص اس لیے کہ وہ بین الاقوامی تعلقات میں ریاست کے کردار کے سخت مخالف تھے۔

کوبڈن ابتدائی دور میں آدم اسمتھ (Adam Smith) کے بین الاقوامی امور سے متعلق خیالات کی غلط تشریح کے بڑے ذمہ داروں میں سے بھی تھے۔ وہ خود کو ایک "اسمتھین" (Smithian) کے طور پر پیش کرتے تھے اور عظیم سکاٹش مفکر کی یاد میں آدم اسمتھ سوسائٹیز کے قیام کی حمایت کرتے تھے۔ تاہم، انہوں نے غلط طور پر یہ دعویٰ کیا کہ اسمتھ کے نزدیک آزاد تجارت امن کا باعث بنتی ہے، وہ امن پسندی (pacifism) کی طرف مائل تھے، ریاستوں کے درمیان مفادات کی ہم آہنگی ممکن سمجھتے تھے، اور فوجی اخراجات میں کمی کے حامی تھے (Van de Haar, 2010)۔

یہ تصور کہ آزاد تجارت ممالک کے درمیان باہمی انحصار پیدا کر کے امن کو فروغ دیتی ہے، اینٹی کارن لا لیگ کے ارکان کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔ ان میں سے بہت سے لوگ اس بات پر بھی یقین رکھتے تھے کہ تجارت تہذیب اور مسیحیت کو دنیا بھر میں پھیلانے کا ذریعہ بنے گی۔ لیگ اور امن پسند تحریک کے درمیان بھی قریبی روابط تھے۔

کوبڈن نے کبھی خود کو امن پسند (pacifist) قرار نہیں دیا، تاہم وہ امن کانفرنسوں میں شریک ہوتے رہے اور اکثر بین الاقوامی امن کے مقصد پر گفتگو کرتے تھے۔ وہ بین الاقوامی سطح پر ایک معروف شخصیت بن گئے، بڑے پیمانے پر سفر کیا، پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے، اور 1860ء میں فرانس کے ساتھ کوبڈن–شیولیے آزاد تجارتی معاہدے (Cobden–Chevalier Treaty) کے مذاکرات میں اہم کردار ادا کیا۔

کوبڈن کے لیے بین الاقوامی معاملات میں اعلیٰ اخلاقی معیارات کا تصور بھی بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔ وہ عدم مداخلت (non-intervention) کے حامی تھے، حتیٰ کہ دوسری ریاستوں کی نوآبادیات کے معاملات میں بھی، اور تنازعات کے حل کے لیے بین الاقوامی ثالثی (international arbitration) کی حمایت کرتے تھے۔

کوبڈن نے طاقت کے توازن پر مبنی خارجہ پالیسی، اسلحے کے حصول، سلطنت سازی اور نوآبادیاتی توسیع کی مخالفت کی۔ ان کا مؤقف تھا کہ جنگ اشرافیہ کے مفادات کی خدمت کرتی ہے، متوسط طبقے کے نہیں (نیز ملاحظہ ہو: Hammarlund, 2005)۔

انیسویں صدی کی آخری چوتھائی سے برطانیہ کے بیشتر سماجی لبرلز اور سوشلسٹوں نے ان میں سے زیادہ تر خیالات کو اپنا لیا۔ یہاں تک کہ امریکی صدر ووڈرو ولسن (Woodrow Wilson) نے خود کو "کوبڈن کا پیروکار" قرار دیا تھا۔

تاہم، اگرچہ بیسویں صدی میں کوبڈن کوئی نمایاں فکری شخصیت نہیں رہے، ان کے خیالات نے بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں بعض لبرٹیرین نقطۂ ہائے نظر کو متاثر کرنا جاری رکھا۔ کوبڈن کے معروف محقق فرینک ٹرینٹ مین (Frank Trentmann, 2006) کے مطابق، اس کی بنیادی وجہ لڈوگ فان مائسز (Ludwig von Mises) کی جانب سے کوبڈن اور "مانچسٹرازم (Manchesterism) " کے حوالوں کا استعمال تھا، اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ مائسز کوبڈن کے بہت سے خیالات سے خود بھی اختلاف رکھتے تھے (Van de Haar, 2009)۔

ہربرٹ اسپنسر

ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer, 1820-1903) بھی برطانیہ اور امریکہ، دونوں میں انتہائی بااثر تھے۔ ان کے کام کو بجا طور پر ابتدائی یا پیش رو لبرٹیرین فکر (proto-libertarianism) قرار دیا جا سکتا ہے۔

لبرٹیرین فکر کی تشکیل پر اثرانداز ہونے والے ان کے اہم خیالات میں سے ایک یہ تھا کہ ریاست یا حکومت کی کسی مخصوص شکل میں کوئی ابدی یا ناقابلِ تغیر حیثیت نہیں ہوتی۔ افراد کسی مخصوص معاشرے میں پیدا ہوتے ہیں، مگر وہ شعوری طور پر اس معاشرے کا انتخاب نہیں کرتے۔ اسپنسر کے مطابق، ہر فرد کو اس وقت ریاست کے اختیار سے علیحدہ ہونے کا حق حاصل ہونا چاہیے جب ریاست اس سے وصول کیے جانے والے ٹیکسوں کے عوض کوئی تحفظ فراہم نہ کرے، یا ناکافی تحفظ فراہم کرے (Spencer, 1982)۔

علیحدگی کا حق (right to secession) کا یہ تصور آج بھی بہت سے لبرٹیرینز میں مقبول ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کے تناظر میں اسپنسر نے مکمل آزاد تجارت، صرف سخت ترین خود دفاع کی صورت میں جنگ، اور سلطنت کے خاتمے کی حمایت کی۔ وہ سلطنت کو "سیاسی نقب زنی" (political burglary) قرار دیتے تھے، جو نہ کوئی معاشی فائدہ پہنچاتی ہے اور نہ ہی اصل ملک کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے؛ بلکہ اس کے برعکس، یہ وہاں ایک خراب اور عسکری ذہنیت کو فروغ دیتی ہے۔

اگرچہ جنگ معاشروں کی ابتدائی تشکیل کے مراحل میں اکثر ایک عنصر رہی تھی، لیکن اسپنسر کے نزدیک جدید معاشروں میں جنگ انفرادیت (individualism) کی ضد بن چکی تھی۔ اس

کے ذریعے ریاست کو افراد کی زندگی کے متعدد پہلوؤں پر اپنا اختیار اور کنٹرول بڑھانے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔

اسپنسر نے اپنی پوری زندگی جنگ کے خاتمے کی جدوجہد میں صرف کی۔ ابتدا میں وہ چاہتے تھے کہ انگلستان اس امن پسند تحریک کی قیادت کرے۔ ان کے نزدیک بین الاقوامی تنازعات کے حل کے لیے بین الاقوامی ثالثی جنگ سے کہیں بہتر راستہ تھا۔

1881ء میں اسپنسر نے ان خیالات کے فروغ اور اس جذبۂ مخالفتِ جنگ کو متحرک کرنے کے لیے اینٹی ایگریشن ایسوسی ایشن (Anti-Aggression Association) قائم کی، جس کے ذریعے وہ اس وسیع پیمانے پر موجود جنگ مخالف جذبات کو منظم کرنا چاہتے تھے جو ان کے خیال میں بالخصوص کاریگر طبقے اور بڑی تعداد میں غیر مطابقت پسند مذہبی گروہوں (dissenters) میں پائے جاتے تھے۔

زندگی کے آخری دور میں اسپنسر انسانیت کو جنگ سے مکمل طور پر نجات دلانے کے امکان کے بارے میں پہلے کی نسبت کم پُرامید ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود، انہوں نے بوئر جنگ (Boer War) کی مخالفت کی اور امن پسند سکاٹش نژاد امریکی صنعت کار اور مخیر شخصیت اینڈریو کارنیگی (Andrew Carnegie) پر زور دیا کہ وہ اس تحریک میں شامل ہوں اور جنگ کے خلاف مہم پر اپنی دولت خرچ کریں (Francis, 2007)۔

کلاسیکی لبرل بمقابلہ لبرٹیرین بین الاقوامی تعلقات

کوبڈن اور اسپنسر کے خیالات نے بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں لبرٹیرین نقطۂ نظر کو متاثر کیا ہے، بالخصوص امریکہ کے ان تھنک ٹینکس سے وابستہ ماہرین کو جن میں کیٹو انسٹی ٹیوٹ (Cato Institute)، مائسز انسٹی ٹیوٹ (Mises Institute)، انڈیپنڈنٹ انسٹی ٹیوٹ

(The Future دی فیوچر آف فریڈم فاؤنڈیشن (Independent Institute) of Freedom Foundation) اور فاؤنڈیشن فار اکنامک ایجوکیشن (Foundation for Economic Education) شامل ہیں۔ گزشتہ چند دہائیوں کے دوران بین الاقوامی تعلقات کے موضوع پر سب سے زیادہ لبرٹیرین تحریری مواد انہی اداروں سے سامنے آیا ہے۔

اس کے باوجود، علمی دنیا میں لبرٹیرین خیالات نسبتاً کم نمایاں رہے ہیں۔ اس حوالے سے ایک استثنائی مثال لومسکی (Lomasky) اور ٹیسون (Tesón) کی کتاب Justice at a Distance: Extending Freedom Globally (2015) ہے، جو بین الاقوامی تعلقات کے لبرٹیرین نقطۂ نظر پر لکھی گئی نایاب علمی کتب میں شمار ہوتی ہے۔

اگرچہ امریکی لبرٹیرین مصنفین کے درمیان بعض معاملات پر اختلافِ رائے پایا جاتا ہے، تاہم امریکی تھنک ٹینکس سے وابستہ ماہرین نے ایک عالمگیر نوعیت کی خارجہ پالیسی (cosmopolitan foreign policy) کا نقطۂ نظر تشکیل دیا ہے، جو لبرٹیرین اصولوں، کوبڈن اور اسپنسر کی تحریروں، اور اس کتاب میں پیش کیے گئے بعض کلاسیکی لبرل خیالات کے امتزاج پر مبنی ہے۔

ایسے مصنفین اکثر امریکی تاریخ، بالخصوص بعض بانیانِ امریکہ (Founding Fathers) میں مقبول محدود حکومت کے تصورات، سے بھی رجوع کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال پریبل (Preble) کی کتاب Peace, War, and Liberty (2019) ہے، جو اس وقت لکھی گئی جب مصنف ابھی کیٹو انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ تھے۔

یہ مصنفین عموماً امریکی خارجہ پالیسی پر زیادہ توجہ مرکوز کرتے ہیں اور بین الاقوامی امور کے بارے میں امریکہ سے باہر پائے جانے والے کلاسیکی لبرل خیالات سے نسبتاً کم سروکار رکھتے ہیں، بلکہ ممکن ہے کہ وہ ان سے بڑی حد تک ناواقف بھی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات دوسرے لوگوں کے

لیے بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں کلاسیکی لبرل اور لبرٹیرین خیالات کو سمجھنااور ان دونوں کے درمیان فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یقیناً، ایسے متعدد معاملات ہیں جن پر کلاسیکی لبرلز اور لبرٹیرینز متفق ہیں، مثلاً آزاد تجارت کی توسیع، عالمگیریت کو ایک مثبت قوت سمجھنا، اور آئی ایم ایف(IMF)، اقوام متحدہ(UN)، عالمی بینک (World Bank) اور عالمی تجارتی تنظیم (WTO) جیسے بین الحکومتی اداروں پر تنقید۔ تاہم، بعض کلاسیکی لبرلز WTO کے کام کی حمایت بھی کرتے ہیں، کیونکہ وہ اسے آزاد تجارت کو فروغ دینے کا ایک عملی، اگرچہ غیر مثالی، ذریعہ سمجھتے ہیں۔

لبرٹیرینز اور بہت سے کلاسیکی لبرلز اس بات پر بھی متفق ہیں کہ عدم مداخلت(non-intervention) خارجہ پالیسی کا ایک بنیادی مقصد ہونا چاہیے، اگرچہ لبرٹیرینز عموماً اس معاملے میں زیادہ مطلق (absolute) مؤقف اختیار کرتے ہیں۔

اسی طرح، دونوں حکومت سے حکومت کو دی جانے والی ترقیاتی امداد کے مخالف ہیں اور جنگ کی بھاری قیمت کو تسلیم کرتے ہیں—جس میں انسانی جانوں کا ضیاع، معاشی نقصان، تباہی اور افراد کی زندگیوں پر ریاستی اختیار و کنڑول میں اضافہ شامل ہے۔

کلاسیکی لبرلز بھی اکثر مخصوص امریکی خارجہ پالیسیوں پر لبرٹیرین تنقید سے اتفاق کرتے ہیں۔ تاہم، کلاسیکی لبرلز کے نزدیک بہت سے لبرٹیرین اس فطری اور جذباتی رشتے کو پوری طرح تسلیم نہیں کرتے جو افراد اور ان کی قوم کے درمیان پایا جاتا ہے، اور جو اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ ریاستیں بین الاقوامی تعلقات میں اہم کردار ادا کرتی رہیں۔

اگرچہ لبرٹیرینز اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان فرشتے نہیں ہیں، کلاسیکی لبرلز اس بات پر مطمئن نہیں کہ لبرٹیرین بین الاقوامی سیاست پر انسانی فطرت کے نتائج کو پوری طرح سمجھتے اور تسلیم کرتے ہیں۔

کلاسیکی لبرلز ریاستی سرگرمیوں سے علیحدگی (secession) کی حمایت میں بھی عموماً لبرٹیرینز سے کم پُرجوش ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں لبرٹیرین فکر کو محض علیحدگی پسندانہ (isolationist) سمجھتے ہیں، جو اس غلط مفروضے پر قائم ہے کہ اگر لوگوں کا ایک گروہ یک طرفہ طور پر دوسروں کے معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا فیصلہ کر لے تو سب کچھ بخوبی چلتا رہے گا۔ زیادہ تر لبرٹیرین مصنفین کی امریکی جڑیں اور ان کے امریکی قارئین پر توجہ ایک اہم سوال کو نظر انداز کرنے کا باعث بنتی ہے:

"اگر عدم صف بندی (non-alignment) کے نتیجے میں دوسرے ممالک آپ کے خلاف صف بندی کر لیں تو کیا ہوگا؟"

دنیا کی سب سے طاقتور ریاست، امریکہ، کے شہری کے لیے یہ تصور کرنا آسان ہے کہ اس کا دفاعی نظام ہر ممکن خطرے اور تشدد سے نمٹنے کے لیے کافی ہوگا۔ لیکن بیشتر دوسرے ممالک کے لیے بین الاقوامی اتحاد خارجہ پالیسی کا ایک ناگزیر عنصر سمجھے جاتے ہیں۔

لبرٹیرینز عموماً کھلی امیگریشن (open immigration) کے حامی ہوتے ہیں اور تجارت اور امن کے درمیان تعلق پر مضبوط یقین رکھتے ہیں۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ بہت سے لبرٹیرینز بعض معاملات میں سماجی لبرلز کے خیالات سے بھی مشابہت رکھتے ہیں، مثلاً کھلی ہجرت اور امن پسندی، نیز جارحانہ جنگ، طاقت کے توازن اور عالمی سیاست میں ریاستِ قوم کے مرکزی کردار کی مخالفت میں۔ وہ خارجہ پالیسی سازی میں طاقتور اشرافیہ کے کردار کے بارے میں بھی شکوک و شبہات رکھتے ہیں۔

جنگ

جنگ سے متعلق غور و فکر بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں لبرٹیرین فکر میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ بعض مفکرین کا خیال ہے کہ اگر تمام ریاستیں علیحدگی پسند (isolationist) پالیسیاں اختیار کر لیں تو جنگ کا مکمل خاتمہ ممکن ہو سکتا ہے، جبکہ دیگر اس حوالے سے زیادہ محتاط اور کم پُرامید ہیں۔ کلاسیکی لبرلز کی طرح روتھبارڈ (Rothbard, 2002) بھی صراحت کے ساتھ ہسپانوی اسکولاسٹک مفکرین (Spanish Scholastics) اور گروشیئس (Grotius) کی روایتِ جنگِ عادل (just war tradition) کو قبول کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جنگ کا مکمل خاتمہ ممکن نہیں، بلکہ اسے 'تہذیب کی عائد کردہ پابندیوں' (limitations imposed by civilization) کے ذریعے محدود کیا جانا چاہیے؛ بالخصوص جنگ میں شہریوں کو دانستہ نشانہ بنانے پر پابندی ہونی چاہیے اور غیر جانب دار ریاستوں (neutral states) کے حقوق کا تحفظ کیا جانا چاہیے۔

لبرٹیرین نقطۂ نظر کے مطابق عادلانہ جنگ وہ ہے جس میں لوگ کسی بیرونی خطرے یا جبری تسلط کے خلاف اپنے دفاع کے لیے لڑیں، یا غیر ملکی تسلط کا خاتمہ کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے برعکس، غیر عادلانہ جنگ وہ ہے جس کا مقصد دوسرے لوگوں پر تسلط قائم کرنا یا پہلے سے موجود جبری اقتدار کو برقرار رکھنا ہو۔ لبرٹیرین نظریۂ جنگ میں بنیادی اصول یہ ہے کہ لبرٹیرین اصولِ عدمِ جارحیت (libertarian axiom) کا اطلاق کیا جائے، یعنی کسی شخص کو دوسرے فرد یا اس کی ملکیت کے خلاف دھمکی دینے یا تشدد کرنے کا حق نہیں۔ صرف اس صورت میں جارح کے خلاف براہِ راست کارروائی جائز ہے جب اس اصول کی خلاف ورزی ہوئی ہو۔ جو بے گناہ لوگ تنازعے میں شریک نہ ہوں، ان کے حقوق کو جوابی کارروائی کے دوران بھی پامال نہیں کیا جانا چاہیے۔ اسی لیے بہت سے لبرٹیریز کے نزدیک بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں (weapons

of mass destruction) کا استعمال، جو جنگجوؤں اور بے گناہوں کے درمیان امتیاز نہیں کرتے، ایک مجرمانہ فعل ہے۔

روتھبارڈ کے لیے غیر جانب داری (neutrality) کا اصول خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ ریاستوں کو تنازعات سے باہر رہنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ وہ غیر جانب داری کو اعلیٰ درجے کی ریاستی بصیرت (statesmanship) سمجھتے ہیں، لیکن افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ اب حکومتیں اسے عمومی طور پر تسلیم نہیں کرتیں، کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اجتماعی سلامتی کے انتظامات (collective security arrangements) ضروری ہیں، یا یہ کہ دنیا بھر میں جمہوریت یا انسانی حقوق نافذ کرنا ایک اخلاقی ذمہ داری ہے۔ روتھبارڈ کے مطابق، 'حقوق آفاقی ہو سکتے ہیں، لیکن ان کا نفاذ مقامی ہونا چاہیے'؛ یعنی ان لوگوں کے ذریعے جو محسوس کرتے ہیں کہ ان کے حقوق پامال ہوئے ہیں (Rothbard, 2003) ۔

ریاستوں پر مشتمل دنیا میں روتھبارڈ کا خیال تھا کہ لبرٹیریز کو حکومتوں پر دباؤ ڈالنا چاہیے کہ وہ جنگ سے مکمل طور پر گریز کریں اور اپنی مسلح افواج کو 'پولیس کی سطح (police levels) ' تک محدود کر دیں۔ اگر تنازع پیدا ہو جائے تو حکومتوں پر دباؤ ڈالا جانا چاہیے کہ وہ فوری طور پر امن مذاکرات کریں، جنگ بندی کا اعلان کریں، غیر جنگجو افراد کو لڑائی سے محفوظ رکھیں، یا اگر وہ براہِ راست فریق نہ ہوں تو غیر جانب دار رہیں۔ روتھبارڈ ان اصولوں کو 'سیاسی علیحدگی پسندی ' (political isolationism) کہے جانے پر بھی معترض نہیں تھے۔ ان کے خیال میں یہ رہنما اصول پر امن بین الاقوامی بقائے باہمی کو ممکن بنا سکتے ہیں۔

تاہم، تمام لبرٹیریز اس حد تک علیحدگی پسندی کے حامی نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر جان ڈینسن (John Denson)' مسلح غیر جانب داری (well-armed neutrality)' کی حمایت کرتے ہیں (Denson, 2003) ۔ بعض لبرٹیرین مفکرین، مثلاً اسٹرومبرگ (Stromberg)، ہاپے (Hoppe, 2003, b) میں یہ مؤقف اختیار کرتے ہیں کہ

گوریلا حکمتِ عملی (guerrilla tactics) استعمال کرنے والی ملیشیائیں قومی دفاع کی بہترین شکل ہیں۔ وہ مختلف ریاستی افواج کے خلاف مختلف گوریلا گروہوں کی مبینہ کامیابیوں کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ان کے نزدیک ملیشیائی گوریلا حکمتِ عملی بے ریاست دنیامیں ریاستوں اور علاقوں کے دفاع کا ذریعہ بن سکتی ہے، یا کسی بڑے علاقے سے علیحدگی اختیار کرنے والے خطوں کو اپنے دفاع کے قابل بنا سکتی ہے۔ان کے مطابق ملیشیائیں لچک دار ہوتی ہیں، نجی ذرائع سے مالی معاونت حاصل کر سکتی ہیں اور انہیں شکست دینا مشکل ہوتا ہے۔

تاہم، ملیشیاؤں کی مؤثریت کے اس تجزیے کو بھی چیلنج کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر، ملیشیائیں اکثر شہری آبادی کے درمیان پناہ لیتی ہیں، جو جنگِ عادل کے ایک بنیادی اصول کی خلاف ورزی ہے۔ مزید برآں، بعض ملیشیائیں اپنے ابتدائی دفاعی علاقے سے آگے اپنی سرگرمیاں پھیلانے، ان شہری آبادیوں پر قبضہ کرنے جو ان کی حمایت نہیں کرتیں، یا دوسری ملیشیاؤں کے خلاف جارحانہ کارروائیاں کرنے کے لیے بھی جانی جاتی ہیں۔

لبرٹیریز اس تصور کو بھی مسترد کرتے ہیں کہ جنگی معیشت (war economy) کے لیے لازماً حکومتی کمانڈ ضروری ہے۔ وہ جنگ کے دوران دیگر ریاستی کنٹرولز، مثلاً سرکاری پروپیگنڈا اور آزادیِ اظہار پر پابندیوں، کی بھی مخالفت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہگز (Higgs, 2005) کا خیال ہے کہ جنگ ہمیشہ معاشی اخراجات کا باعث بنتی ہے اور 'جنگی خوشحالی (war prosperity)' نام کی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی۔ حکومتیں بحران کے دوران عوام کی طرف سے اپنی خدمات کی بڑھتی ہوئی طلب کو استعمال کرتی ہیں اور بحران ختم ہونے کے بعد بھی ریاستی طاقت کو مکمل طور پر سابقہ سطح پر واپس نہیں لاتیں۔ یوں ریاست اپنے اختیارات اور افراد کی زندگیوں پر اپنا اثر و رسوخ بڑھاتی جاتی ہے۔

اس مفہوم میں جنگ حتمی نوعیت کا بحران (ultimate crisis) ہے، اور دہشت گردی کے خلاف جنگ (war against terrorism) بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ہگز، نیز دیگر

لبرٹیرین مفکرین ایبلنگ (Ebeling) اور ہارن برگر (Hornberger, 2003) نے نشاندہی کی ہے کہ 11 ستمبر کے حملوں کے بعد، خصوصاً امریکہ میں، حکومتی اخراجات میں بہت بڑا اضافہ ہوا اور شہری آزادیوں پر پابندیاں بھی بڑھیں۔

نجی دفاع (Private Defense)

ہوپے (Hoppe, 2003, a) حکومت کو 'تحفظ اور دائرۂ اختیار کی لازمی علاقائی اجارہ دار' (compulsory territorial monopolist of protection and jurisdiction) قرار دیتے ہیں، جسے عوام کی متفقہ رضامندی کے بغیر ٹیکس عائد کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں حکومت دفاع فراہم کرنے میں ناکام رہے گی۔ وہ بھی ایک ایسی اجارہ دار ہے جو زیادہ قیمت وصول کرتی ہے لیکن ناقص معیار کی خدمات فراہم کرتی ہے۔ ہوپے (2003, a) اور بلاک (Block, 2003) دونوں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ دفاع ایک عوامی شے (public good) نہیں ہے اور نجی دفاع اس کا بہتر متبادل ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی نیا تصور نہیں۔ اس کی بنیاد انیسویں صدی کے ماہرِ معاشیات دے مولیناری (De Molinari، 1849) کی تحریروں میں بھی ملتی ہے، جنہوں نے استدلال کیا تھا کہ بیرونی حملوں کے خلاف فوجی سلامتی فراہم کرنے کے لیے ریاست کا ہونا ضروری نہیں۔

ہوپے (2003, a) کے مطابق بیرونی دفاع کے لیے نجی انشورنس کمپنیوں کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی غیر ملکی ریاست کی جانب سے حملہ ہو تو علاقے کا دفاع مسلح شہریوں اور انشورنس وری انشورنس کمپنیوں کے اتحاد کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ ان کے مطابق یہ کوششیں لازماً جارح ریاست کی کوششوں سے بہتر ہوں گی، کیونکہ ایک ریاست، تعریف کے اعتبار سے، نجی اداروں کے مقابلے میں کم مؤثر انداز میں منظم ہوتی ہے۔ ہوپے کا دعویٰ ہے کہ انشورنس کمپنیاں پہلے سے ممکنہ خطرات

سے آگاہ ہوں گی اور ان خطرات کو انشورنس پریمیم کے تعین میں شامل کر لیا جائے گا۔ وہ توقع کرتے ہیں کہ انشورنس کمپنیاں جارحیت کی روک تھام کریں گی اور ممکنہ طور پر جارح ریاست کے 'علاقے کی آزادی اور تبدیلی (liberation and transformation of the state territory)' کی کوشش میں بھی کردار ادا کریں گی۔ ان کے خیال میں نجی سیکورٹی کمپنیوں پر مبنی دنیا میں جنگ کے امکانات بھی کم ہوں گے، کیونکہ سیکورٹی کمپنیوں کے اپنے مفاد میں یہ ہوگا کہ وہ لڑائی سے گریز کریں۔

تاہم، ہوپے کے اس تصور میں متعدد ایسے مفروضے شامل ہیں جنہیں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ مزید یہ کہ ان کا نقطۂ نظر بین الاقوامی تعلقات کے نظریے کے مقابلے میں زیادہ تر معاشی تجزیے کی مشق معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ سیاسی خطرات اور غیر یقینی صورتِ حال سے نمٹنے والی متعدد انشورنس کمپنیاں، اور تنازعات میں کام کرنے والی نجی سیکورٹی کمپنیاں موجود ہیں، لیکن بیشتر مسلح تنازعات اب بھی ریاستوں کے درمیان، یا ریاستوں اور ایسی گوریلا یا دہشت گرد تنظیموں کے درمیان ہوتے ہیں جو ریاست کے زیرِ کنٹرول وسائل یا پالیسیوں میں حصہ یا تبدیلی چاہتی ہیں۔

مزید برآں، دفاع کے بارے میں ہوپے کا لبرٹیرین معاشی نقطۂ نظر مختلف علاقوں کی دفاعی صلاحیتوں میں موجود فرق کو نظر انداز کرتا ہے، جو افرادی قوت، جغرافیہ، ارضی ساخت یا معاشی طاقت جیسے عوامل کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ عوامل اجتماعی کارروائی (group action) پر سنگین پابندیاں عائد کر سکتے ہیں، خواہ اس کی مالی معاونت نجی ذرائع سے ہو یا ٹیکس دہندگان کے ذریعے۔ ان کے تجزیے میں بین الاقوامی سطح کی دیگر خصوصیات، مثلاً توازنِ طاقت (balance of power)، کو بھی خاطر میں نہیں لایا گیا۔

آخر میں، یہ پورا تصور انسانی فطرت کے ایک انتہائی عقلی (strictly rational) تصور پر مبنی ہے، جو کم از کم قابلِ بحث ضرور ہے۔ مزید یہ کہ اس میں کسی تجرباتی ثبوت کے بغیر یہ فرض کر لیا گیا

ہے کہ نجی انشورنس پر مبنی دفاع اکثر گہری مالی صلاحیت رکھنے والے ریاستی فوجی نظام سے زیادہ مؤثر ثابت ہو گا۔

امریکی خارجہ پالیسی

بہت سے 'لبرٹیریز (libertarians) ' بین الاقوامی امور پر اپنی تحریروں میں امریکی خارجہ پالیسی کو خصوصی توجہ کا مرکز بناتے ہیں۔ ان کا استدلال ہے کہ فوجی اتحاد امریکہ کو ایسی غیر ضروری جنگوں میں ملوث کر دیتے ہیں جو اس کی سلامتی کے لیے کوئی واضح اور فوری خطرہ نہیں ہوتیں (مثلاً Higgs, 2005)۔ ان کے نزدیک امریکہ کو 'دنیا کا پولیس مین' (world's policeman) بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، اور امریکی دفاع کا بنیادی، بلکہ شاید واحد، مقصد دشمن ریاستوں کے حملوں سے امریکی شہریوں اور ان کی املاک کا تحفظ ہونا چاہیے۔ امریکہ کو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے فوجی اڈوں کے ذریعے 'عالمی سلطنت (global empire) ' بھی برقرار نہیں رکھنی چاہیے۔

جانی و مالی نقصانات کے علاوہ، بہت سے لبرٹیریز امریکہ کی بیشتر، بلکہ بعض اوقات تقریباً تمام، بیرونی مداخلتوں کو 'بانیانِ ریاست (Founding Fathers) ' کے ارادوں کے منافی سمجھتے ہیں۔ کارپینٹر (Carpenter, 1989, 2002) اور ایلینڈ (Allend, 2004) جیسے لبرٹیریز کا استدلال ہے کہ جمہوریت کے لیے امریکی حمایت کی ساکھ اس وقت متاثر ہوتی ہے جب امریکہ اقتدار میں موجود آمروں کی حمایت کرتا ہے۔ ان کے مطابق اس طرزِ عمل سے امریکہ مخالف جذبات پیدا ہو سکتے ہیں اور حتیٰ کہ امریکہ یا امریکی شہریوں کے خلاف دہشت گردانہ حملوں کو بھی ہوا مل سکتی ہے۔

ان کا خیال ہے کہ امریکہ کو NATO اور جاپان و جنوبی کوریا کے ساتھ اپنے دفاعی معاہدوں جیسے فوجی اتحادوں سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ تاہم، کارپینٹر (Carpenter, 1995) جو دیگر لبرٹیریز کے مقابلے میں زیادہ جارحانہ تجزیہ پیش کرتے ہیں، کا کہنا ہے کہ امریکہ کو 'بین الاقوامی

نظام میں آخری سہارے کے طور پر توازن قائم کرنے والی قوت (balancer of last resort) ' کا کردار ادا کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ امریکہ اپنی اتنی فوجی طاقت برقرار رکھے کہ وہ بین الاقوامی استحکام کو درہم برہم کرنے والے 'غیر معمولی طور پر طاقتور توسیع پسندانہ خطرات' کو روک سکے، جنہیں دیگر چھوٹی طاقتوں کے باہمی اتحاد کے ذریعے قابو میں نہ لایا جا سکے۔ تاہم، اس تصور کو بعض حالات میں امریکی بیرونی مداخلت کی حمایت کے مطالبے کے طور پر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

دوسرے لبرٹیریز، مثلاً راک ویل (Rockwell, 2003) اور ایبلنگ و ہارن برگر (Ebeling and Hornberger, 1996) امریکی طاقت کے مسلسل وجود اور اس کے پھیلاؤ کے بارے میں زیادہ تشویش کا اظہار کرتے ہیں اور عموماً 'عدم مداخلت' (non-interventionism) کی حمایت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک 'ایک سلطنت' (an empire) کو برقرار رکھنے کی خواہش امریکی خارجہ پالیسی کی متعدد غلطیوں کی بنیادی وجہ ہے۔ وہ اکثر مبینہ امریکی سلطنت کے حجم کا اندازہ بیرونِ ملک امریکی فوجی اڈوں کی تعداد یا دوسرے ممالک میں کی جانے والی امریکی فوجی مداخلتوں کی تعداد سے لگاتے ہیں۔

یہ مفکرین بعض اوقات یہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ امریکہ کی ہر بیرونی کارروائی متعلقہ ملک کے عوام کی مرضی کے خلاف ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر، اوکیناوا میں موجود بڑے امریکی فوجی اڈے کی وجہ سے وہ امریکی فوج کو جاپان پر قابض سمجھ سکتے ہیں، حالانکہ جاپانی حکومت اور بہت سے جاپانی شہری امریکی فوجی موجودگی کو چین کی بڑھتی ہوئی عسکری طاقت کے مقابلے میں تحفظ کے ایک ذریعے کے طور پر بھی دیکھ سکتے ہیں۔

تاہم، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ بعض کلاسیکی لبرلز (classical liberals) امریکی بیرونی مداخلت کی ضرورت اور اس کے جواز پر سوال اٹھا سکتے ہیں۔

آئن رینڈ(Ayn Rand)

آئن رینڈ اپنے ناولوں اور غیر افسانوی تحریروں کے ذریعے معروف ترین لبرٹیرین مفکرین میں شمار ہونے لگیں۔ اگرچہ ان کی تحریروں میں مینارکسٹ (minarchist) رجحانات واضح طور پر موجود ہیں، لیکن وہ خود کو دوسرے لبرٹیرین مفکرین کے ساتھ شامل کیے جانے کی خواہاں نہیں تھیں اور اپنے فلسفے کو آبجیکٹوازم (Objectivism) کا نام دیتی تھیں۔ بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں ان کی آرا اور خیالات بھی دوسرے لبرٹیریز سے نمایاں طور پر مختلف تھے (Van de Haar, 2019)۔

سب سے بڑھ کر، آبجیکٹوازم ایک اخلاقی نظریہ (moral theory) ہے، تاہم اس میں سیاست کو بھی اہم مقام حاصل ہے۔ عالمی سیاست رینڈ کی بنیادی سیاسی تشویشات میں شامل تھی۔ ایک روسی مہاجر کی حیثیت سے وہ کمیونزم سے شدید نفرت کرتی تھیں، بلکہ ممکنہ طور پر فاشزم، نیشنل سوشلزم، قوم پرستی اور نسلی عصبیت جیسے دیگر اجتماعی نظریات سے بھی زیادہ۔ آبجیکٹوازم کے مطابق بیرونی حملے کے خلاف دفاع حکومت کے صرف تین جائز فرائض میں سے ایک ہے؛ باقی دو پولیس اور عدلیہ ہیں۔ آبجیکٹو ازم کے پیروکاروں کے مطابق حکومت کو جوابی تشدد (retaliatory violence) پر اجارہ داری حاصل ہونی چاہیے۔ رینڈ نے نہ تو ہتھیاروں کی نجی ملکیت کی حمایت کی اور نہ ہی نجی ذرائع سے مالی اعانت حاصل کرنے والے دفاعی نظام کی۔

رینڈ افراد کے لیے قومی ثقافت اور لاشعوری 'احساسِ زندگی (sense of life) 'کو بھی اہم سمجھتی تھیں۔ وہ امریکیوں میں 'انفرادیت پسندانہ جذبے (individualist spirit) 'کو دوبارہ مضبوط کرنا چاہتی تھیں، کیونکہ ان کے خیال میں یہ جذبہ خطرے میں تھا۔ وہ خود مختاری (sovereignty) کو ایسا حق سمجھتی تھیں جو حاصل بھی کیا جا سکتا ہے اور کھویا بھی جا سکتا ہے۔

کوئی قوم اس حق کو حاصل اور اخلاقی طور پر محفوظ کر سکتی ہے اگر وہ انفرادی حقوق کے اصول کا مکمل احترام کرے۔ ایسی صورت میں دوسری اقوام پر لازم ہے کہ وہ اس کی خود مختاری کا احترام کریں۔ اس کے برعکس، اگر کوئی ملک اپنے شہریوں کے حقوق کی خلاف ورزی کرے تو وہ اپنی خود مختاری کے حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ رینڈ نے اپنے مخصوص سخت لہجے میں لکھا کہ 'طاقت کے ذریعے حکمرانی کی جانے والی قوم، قوم نہیں بلکہ ایک ہجوم ہے'، خواہ اس کی قیادت اٹیلا، چنگیز خان، ہٹلر، خروشیف یا کاسترو کر رہا ہو (Rand، 1964)۔ ان کے نزدیک آمریتیں قانون سے باہر ریاستیں (outlaws) ہیں اور ان پر اس وقت حملہ کیا جا سکتا ہے جب حملہ آور ریاست کا مقصد انفرادی حقوق کی بحالی ہو۔ چنانچہ حقِ خودارادیت (self-determination) کا مطلب صرف یہ حق ہے کہ کوئی قوم ایک آزاد قوم بن سکے۔

رینڈ نے کسنجر (Kissinger) جیسے حقیقت پسند (realist) مفکرین کو بھی سخت تنقید کا نشانہ بنایا، کیونکہ ان کے خیال میں وہ بین الاقوامی سیاست میں اخلاقیات کو نظر انداز کرتے یا 'عملی' اور 'حکمتِ عملی' کی بنیاد پر آمریتوں کی حمایت کرتے تھے۔ انہوں نے صدر نکسن کی چین کے حوالے سے امریکی خارجہ پالیسی میں تبدیلی کی مخالفت کی، کیونکہ وہ اسے تائیوان سے غداری سمجھتی تھیں۔

سرد جنگ کے دوران کمیونزم اور ان اقوام کے خلاف جنہیں وہ انفرادی آزادی کا مخالف سمجھتی تھیں، رینڈ کا لہجہ انتہائی جارحانہ تھا، خصوصاً چین کے بارے میں۔ وہ ایک پُرامن دنیا کی توقع نہیں رکھتی تھیں، کیونکہ ان کے نزدیک مکمل امن صرف مکمل طور پر عقلی انسانوں کے ذریعے ممکن تھا، جبکہ دنیا غیر عقلی رویوں اور تنازعات کے اسباب سے بھری ہوئی ہے۔

ان کے خیال میں جنگ انسانی فطرت کا حصہ ہے، لیکن اسے صرف جوابی کارروائی کے طور پر اور صرف اس فریق کے خلاف استعمال کیا جانا چاہیے جس نے تشدد کا آغاز کیا ہو۔ آبجیکٹو ازم کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ کسی فرد یا ریاست کو تشدد شروع کرنے کا حق حاصل نہیں۔ اس لیے بین

الاقوامی نظم کا انحصار 'برائی کی قوتوں' کے خلاف مضبوط دفاع پر ہے۔ اسی تناظر میں رینڈ نے عالمی سیاست میں توازنِ طاقت (balance of power) کو اہمیت دی۔

رینڈ لبرل پالیسیوں یا نظریات کے ان دعووں کو بھی مسترد کرتی تھیں کہ وہ دنیا میں امن کو فروغ دے سکتے ہیں۔ وہ جوہری ہتھیاروں کی دوڑ (nuclear arms race) کو ضروری سمجھتی تھیں، امن پسندی (pacifism) کو برا سمجھتی تھیں اور مسلح افواج میں کمی کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتی تھیں۔

انہوں نے لبرل بین الاقوامیت (liberal internationalism) پر بھی واضح تنقید کی۔ وہ اس تصور کے خلاف تھیں کہ عالمی برادری کے مفاد کے لیے کسی قوم کی خود مختاری یا قومی مفادات کو قربان کیا جائے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ افراد کے حقوق اور مفادات کے منافی ہے۔ وہ اقوام متحدہ (UN) کی بھی مخالف تھیں، خصوصاً اس لیے کہ ان کے خیال میں اس نے سوویت یونین اور دیگر آمریتوں کو ایسا بین الاقوامی وقار فراہم کیا جس کی وہ مستحق نہیں تھیں۔

دوسرے بہت سے لبرلز کی طرح رینڈ نے فوجی بھرتی (military draft) کی مخالفت کی اور ویتنام جنگ پر بھی اعتراض کیا۔ اس وجہ سے وہ 1960ء اور 1970ء کی دہائی کے بعض کارکنوں میں عارضی طور پر مقبول ہوئیں، اگرچہ یہ کارکن عموماً آزاد تجارت اور سرمایہ داری کے حق میں، اور ترقیاتی امداد اور بین الاقوامی قانون کے خلاف ان کے دیگر خیالات سے اختلاف رکھتے تھے۔

تاہم، رینڈ کا یہ بھی ماننا تھا کہ ایک مرتبہ معاہدے طے پا جائیں تو ان کی پابندی کی جانی چاہیے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آئن رینڈ کے خیالات کو کلاسیکی لبرل اور بعض لبرٹیرین تصورات کے امتزاج کے طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ تاہم، عالمی سیاست کے بعض اہم اور معاصر مسائل پر ان کے نسبتاً جارحانہ اور غیر سفارتی خیالات نے انہیں دوسرے لبرٹیرین مفکرین سے نمایاں طور پر مختلف کر دیا۔

لبر ٹیرین بین الاقوامی تعلقات بمقابلہ کلاسیکی لبرل بین الاقوامی تعلقات

اگرچہ کلاسیکی لبرلز اور لبر ٹیریز کے خیالات میں خاصی مماثلت پائی جاتی ہے—خصوصاً اس لیے کہ ان کے بہت سے نظریات کی فکری بنیاد ایک ہی مفکرین کے ہاں ملتی ہے—تاہم خارجہ پالیسی کے بارے میں لبر ٹیریز کے بیشتر خیالات کا تعلق امریکی تناظر سے ہے۔ اس وجہ سے امریکی لبر ٹیریز اکثر عالمی معاملات کو امریکی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، بہت سے لبر ٹیریز خارجہ پالیسی کو معاشی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور جنگ و فوجی مداخلت کے اخراجات کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہیں اکثر ایسی 'امریکی سلطنت' (American empire) کے بارے میں بھی تشویش رہتی ہے جو اپنے مفادات کے تحفظ اور توسیع کے لیے عالمی سطح پر طاقت استعمال کرتی ہے۔

تاہم، دونوں کے درمیان سب سے بنیادی فرق انسانی فطرت کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر اور انسانی رویے کی پیش گوئی اور وضاحت میں عقل (reason) کے کردار سے متعلق ہے۔

تیرہواں باب

خلاصہ

اس کتاب میں بین الاقوامی تعلقات کے کلاسیکی لبرل نظریے کے خدوخال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ نظریہ محض مجرد اصولوں سے استدلال کی بنیاد پر تشکیل نہیں دیا گیا، بلکہ بنیادی طور پر چار کلاسیکی لبرل مفکرین ڈیوڈ ہیوم، ایڈم اسمتھ، لڈوِگ فان میزس اور ایف۔اے۔ہائیک کی تحریروں سے اخذ کیا گیا ہے۔ پہلے دو مفکرین نے اٹھارہویں صدی میں، جبکہ آخری دو نے گزشتہ صدی میں بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں لکھا۔ اس کتاب نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے خیالات آج کے بین الاقوامی تعلقات کے لیے بھی کس طرح اہم ہیں۔

اس مقصد کے لیے یہاں ایک ایسا نظریہ پیش کیا گیا ہے جو بنیادی اصولوں سے شروع ہوتا ہے اور فرد سے، پھر اس کے قریب ترین گروہوں سے ہوتے ہوئے، بین الاقوامی سطح تک پھیلتا ہے۔ اس لحاظ سے داخلی کلاسیکی لبرل ازم اور بین الاقوامی کلاسیکی لبرل ازم میں کوئی بنیادی فرق نہیں : فرد کی آزادی کا تحفظ اور اس کا فروغ ہی بنیادی مقصد ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کا پیش کردہ کلاسیکی لبرل نظریہ انسانی فطرت اور فرد کے مختلف گروہوں، خصوصاً قوم اور ریاست، کے ساتھ تعلق کے جائزے پر مبنی ہے۔ کلاسیکی لبرلز کے لیے قومی ریاست

کو بین الاقوامی تعلقات میں مرکزی کردار ادا کرنے والا فطری ادارہ سمجھنااس لیے منطقی ہے کہ وہ زیادہ تر انسانوں میں اپنی قوم کے ساتھ ایک جذباتی اور نفسیاتی تعلق کو تسلیم کرتے ہیں۔

انسانی فطرت کے بارے میں اپنے حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر کی بنیاد پر کلاسیکی لبرل ازم تنازع اور جنگ کے ناگزیر ہونے کو بھی تسلیم کرتا ہے اور اس حقیقت سے نمٹنے کی کوشش کرتا ہے، خواہ یہ کتنی ہی افسوس ناک کیوں نہ ہو۔ کلاسیکی لبرلز کے نزدیک بین الاقوامی نظم مختلف ذرائع اور اقدامات کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔اس کے لیے کوئی ایک جادوئی نسخہ موجود نہیں۔ چنانچہ طاقت کا توازن جیسے خود بخود قائم ہونے والے انتظامی عوامل کے ساتھ ساتھ محدود مگر مضبوط تحریری بین الاقوامی قواعد بھی ضروری ہیں۔

کلاسیکی انسانی حقوق کے تحفظ اور ریاستوں پر مشتمل دنیامیں پیدا ہونے والے زیادہ تر عملی مسائل پر اتفاقِ رائے پیدا کرنے کے لیے بین الاقوامی قانون اور محدود تعداد میں فعال نوعیت کی بین الحکومتی تنظیموں کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ کلاسیکی لبرلز عالمی آزاد تجارت اور عالمگیریت کے بھی حامی ہیں، کیونکہ ان سے بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں، جن میں دنیا بھر میں بڑی تعداد میں لوگوں کا غربت سے نکلنا بھی شامل ہے۔تاہم، آزاد تجارت کو لازماً امن کا باعث سمجھنا درست نہیں۔

کلاسیکی لبرلز عموماً حکومت سے حکومت کو دی جانے والی، ٹیکس دہندگان کے پیسے سے چلنے والی بین الاقوامی امداد کے بارے میں شکوک رکھتے ہیں، اگرچہ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر قلیل مدتی قدرتی آفات کی امداد کے حامی ہو سکتے ہیں۔ رضاکارانہ سرگرمیوں پر اپنے یقین کے مطابق وہ افراد کی جانب سے غیر ریاستی خیراتی اداروں یا غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کی مدد کی مخالفت نہیں کرتے۔

آخر میں، کلاسیکی لبرلز تحفظ اور restraint یعنی ضبط و احتیاط پر زور دیتے ہیں۔ فوجی مداخلت ایک استثنائی اقدام ہونی چاہیے۔ سامراجیت کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں، اور نہ ہی قوم پرستی جیسے اجتماعی

نظریات کے لیے۔ امیگریشن کا مسئلہ اب بھی بحث طلب ہے، تاہم اس کتاب میں پیش کیے گئے کلاسیکی لبرل نظریے کے مطابق امیگریشن پر پابندیاں عائد کرنا مکمل طور پر قابل قبول ہے۔

فریڈن (Freeden) کے نظریاتی ساختی تجزیے (morphological analysis) کا اطلاق یہ ظاہر کرتا ہے کہ داخلی سیاست میں کلاسیکی لبرل ازم سماجی لبرل ازم، لبر ٹیرین ازم اور قدامت پسندی سے نمایاں طور پر مختلف ہے(Van de Haar 2015) ۔یہی فرق بین الاقوامی سیاست میں بھی موجود ہے، جہاں تجزیہ کلاسیکی لبرل ازم اور موجودہ دیگر لبرل بین الاقوامی تعلقات کے نظریات کے درمیان نمایاں فرق کو ظاہر کرتا ہے۔

یہ موجودہ لبرل IR نظریات، جو عموماً جامعات میں پڑھائے بھی جاتے ہیں، عالمی سیاست میں قومی ریاستوں کے مرکزی کردار کے مبینہ منفی اثرات کو کم کرنے پر توجہ دیتے ہیں، جن میں طاقت کی سیاست اور جنگ کا وقوع بھی شامل ہے۔ لوگوں کے مفادات کے مابین ایک مبینہ عالمی ہم آہنگی کی بنیاد پر یہ نظریات بین الاقوامی اور بالادست سطح کے قوانین اور بین الاقوامی حکومتی تنظیموں کے حوالے سے کئی دور رس تجاویز پیش کرتے ہیں۔ بعض تو عالمی معاشرے یا عالمی وفاقی حکومت کے بھی حامی ہیں۔

عمومی طور پر یہ لبرل بین الاقوامیت پسند اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بین الاقوامی سیاست میں طاقت کی سیاست کی جگہ اخلاقیات کو مرکزی حیثیت دی جانی چاہیے۔ کلاسیکی لبرلز ایسے خیالات سے گریز کرتے ہیں، کیونکہ وہ انہیں مثالی اور غیر حقیقت پسندانہ سمجھتے ہیں۔ وہ دنیا اور انسانوں کو ویسا ہی قبول کرتے ہیں جیسے وہ حقیقت میں ہیں، نہ کہ ویسا جیسا ہم انہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔

کلاسیکی لبرلز اور لبر ٹیریز کے درمیان فرق بھی خاصا نمایاں ہے۔ لبر ٹیریز جنگ یا کسی بھی فوجی مداخلت میں شرکت کے بارے میں عموماً زیادہ شکوک رکھتے ہیں، خواہ اس کا مقصد کتنا ہی جائز کیوں نہ دکھائی دے۔ ان کے نزدیک ایسی غیر جانب داری، بلکہ مکمل علیحدگی پسندی (isolationism) بھی، ایک زیادہ پُرامن دنیا تشکیل دے سکتی ہے۔

تاہم، یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ زیادہ تر لبرٹیرین مصنفین امریکی ہیں اور بنیادی طور پر امریکی قارئین کے لیے لکھتے ہیں۔ چونکہ امریکہ دنیا کی سب سے طاقتور معاشی، عسکری اور، غالباً، ثقافتی طاقت ہے، اس لیے یہ حقیقت امریکی لبرٹیرینز کے نقطۂ نظر کو لازماً متاثر کرتی ہے، جبکہ ان کے نظریات کی دنیا کے دیگر ممالک پر اطلاق پذیری کو محدود بھی کرتی ہے۔

بعض لبرٹیرین بین الاقوامی امور کو بنیادی طور پر معاشی لین دین کے زاویے سے بھی دیکھتے ہیں، مثلاً نجی سطح پر دفاع کی فراہمی جیسے مسائل پر توجہ دیتے ہوئے جنگ کے متعدد دیگر اسباب جیسے اہم عوامل کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔

اس کتاب میں کلاسیکی لبرل ازم اور غیر لبرل IR نظریات کے درمیان اس سے بھی زیادہ بنیادی فرق کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے، اور کلاسیکی لبرل خیالات کا انگلش اسکول (English School) کے بین الاقوامی تعلقات کے تین روایتی نظریات کے ساتھ تقابلی مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کلاسیکی لبرل ازم کی سب سے بہتر مطابقت کثرت پسند بین الاقوامی معاشرے (pluralist international society) کی روایت کے ساتھ ہے، جبکہ زیادہ تر دیگر لبرل IR نظریات کو عالمی معاشرے (world society) کی روایت سے زیادہ قریب سمجھا جا سکتا ہے۔

حقیقت پسندی (Realism)، جو IR کے اہم نظریات میں سے ایک ہے، بین الاقوامی نظام کی روایت (international system tradition) سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ درست ہے کہ حقیقت پسندی اور کلاسیکی لبرل IR نظریے میں کچھ مشترک خیالات موجود ہیں، مثلاً عالمی سیاست میں قومی ریاست کا مرکزی کردار، طاقت کے توازن کی اہمیت، اور اس بات کا اعتراف کہ جنگ بعض اوقات ناگزیر ہوتی ہے۔

تاہم، کلاسیکی لبرل بین الاقوامی تعلقات کے نظریے کو محض حقیقت پسندی کی ایک قسم نہیں سمجھنا چاہیے۔ کلاسیکی لبرلز بین الاقوامی نظم کے قیام کے امکان کے بارے میں بین الاقوامی نظام کے نظریہ

سازوں سے زیادہ پُرامید ہیں۔ان کی بنیادی تشویش ریاست کے مفادات نہیں بلکہ فرد کی آزادی ہے۔وہ بڑی طاقتوں کے ذریعے عالمی نظم کے انتظام کے اصول کو بھی کم قبول کرتے ہیں، کیونکہ بہت سے کلاسیکی لبرلز کا خیال ہے کہ قومی ریاستوں کے حقِ خود مختاری کا احترام کیا جانا چاہیے۔

کلاسیکی لبرلز یہ بھی سمجھتے ہیں کہ کچھ بین الاقوامی قوانین اور بین الاقوامی حکومتی تنظیمیں مفید ہیں، لیکن فرد کی آزادی کے تحفظ کے لیے ان کا دائرہ محدود ہونا چاہیے۔وہ عالمی سیاست کو مکمل انارکی کے طور پر نہیں دیکھتے بلکہ اسے قومی ریاستوں کے ایک ایسے انارکیکل معاشرے کے طور پر سمجھتے ہیں جہاں اخلاقی اصولوں کے لیے بھی گنجائش موجود ہے۔

سب سے بنیادی طور پر کلاسیکی لبرلز انسانی فطرت کے بارے میں حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں، جو حقیقت پسندوں کے نسبتاً منفی تصور سے مختلف ہے۔فرق یہ ہے کہ کلاسیکی لبرلز انسان کی سماجی فطرت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس تصور کو مسترد کرتے ہیں کہ انسان بنیادی طور پر خود غرض ہوتا ہے۔

کلاسیکی لبرلز کے نزدیک اقوام کا معاشرہ سب سے زیادہ مستحکم بین الاقوامی نظم پیش کرتا ہے، جو فرد کی آزادی کو محفوظ بنانے کا بہترین ذریعہ ہے، یا کم از کم ایسے بہترین بین الاقوامی حالات فراہم کرتا ہے جن میں فرد کی آزادی حاصل کی جاسکتی ہے۔تاہم، اس کا انحصار داخلی سیاسی و معاشرتی انتظامات پر بھی ہے۔

داخلی سیاست کے حوالے سے حقیقت پسندی اکثر قدامت پسندی یا نوقدامت پسندی سے وابستہ کی جاتی ہے۔دوسری جانب، بین الاقوامی سیاست دنیا بھر میں بہت سے لوگوں کی زندگیوں کو متاثر کرتی ہے۔کلاسیکی لبرل ازم ایک عالمگیر نظریہ (universalist theory) ہے، جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے بنیادی خیالات دنیا کے مختلف معاشروں پر قابلِ اطلاق ہیں۔

اس کتاب نے یہ مؤقف پیش کیا ہے کہ کلاسیکی لبرل ازم بین الاقوامی امور کے بارے میں ایک منفرد نقطۂ نظر رکھتا ہے اور لبرل بین الاقوامی تعلقات کے نظریے میں اپنے لیے ایک الگ مقام کا مستحق ہے۔ تاہم، یہ تسلیم کرنا بھی ضروری ہے کہ اس حوالے سے مزید بہت سا کام ہونا باقی ہے۔

یقیناً وہ تمام لوگ جو خود کو کلاسیکی لبرل کہتے ہیں، یورپی یونین یا میگریشن جیسے مسائل پر ایک ہی رائے نہیں رکھتے۔ جامعات اور دیگر علمی و فکری حلقوں میں ہر نوع کے لبرلز کے مابین مزید تجزیے، تحقیق، مباحثے اور مکالمے کی ضرورت ہے۔ مزید کلاسیکی لبرل مصنفین کا مطالعہ بھی ضروری ہے تاکہ بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں ان کے خیالات کو بہتر طور پر سمجھا اور نظریے میں شامل کیا جا سکے۔

دوسرے حصے میں زیرِ بحث بہت سے بنیادی تصورات بھی مزید مطالعے اور غور و فکر کے متقاضی ہیں۔ اس کتاب نے موجودہ خارجہ پالیسی کے مباحث پر کلاسیکی لبرل خیالات کے اطلاق کی ایک محتاط کوشش کی ہے۔ کلاسیکی لبرل خیالات کو موجودہ بین الاقوامی امور سے مزید مربوط کرنے کے لیے مزید کام کی ضرورت ہے تاکہ کلاسیکی لبرل ازم کی کشش وسیع تر حلقوں تک پہنچ سکے۔

تاہم، یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ کلاسیکی لبرل ازم محض ایک داخلی سیاسی نظریہ نہیں ہے جس کے پاس بین الاقوامی امور کے بارے میں کہنے کو بہت کم ہو۔ کلاسیکی لبرل مفکرین نے عالمی سیاست کے بارے میں منفرد خیالات پیش کیے ہیں جنہیں موجودہ خارجہ پالیسی کے مسائل پر لاگو کیا جا سکتا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کے دیگر لبرل نظریات کے مقابلے میں کلاسیکی لبرل ازم بھی اتنا ہی اہم اور متعلقہ ہے۔ لبرل ازم اور بین الاقوامی تعلقات کے درمیان تعلق اس سے کہیں زیادہ وسیع اور متنوع ہے جتنا اب تک سمجھا جاتا رہا ہے۔

مطالعہ و مزید مراجع

Literature and Further Reading

براہِ کرم نوٹ کریں کہ اس کتاب کے بیشتر ابواب میں درج ذیل دو کتب کے بعض حصے استعمال کیے گئے ہیں:

Van de Haar, E. R. (2009) *Classical Liberalism and International Relations Theory: Hume, Smith, Mises, and Hayek.* New York and Basingstoke: Palgrave Macmillan.

اور

Van de Haar, E. R. (2015) *Degrees of Freedom: Liberal Political Philosophy and Ideology.* New York and London: Routledge.

مزید بحث اور تفصیلی حوالہ جات کے لیے ان کتب سے رجوع کریں۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ آن لائن بہت سے عمدہ ذرائع دستیاب ہیں، جہاں متعدد مکمل کتب اکثر مفت فراہم کی جاتی ہیں، مثلاً Online Library of Liberty، Adam Smith Works، IEA.org، Mises.org، اور Liberty Fund۔

Chapter 1: Introduction

1. Brown, C. and Eckersley, R. (2018) *The Oxford Handbook of International Political Theory.* Oxford University Press.
2. Cunliffe, P. (2020) *The New Twenty Years' Crisis: A Critique of International Relations 1999–2019.* Montreal and Kingston: McGill-Queen University Press.
3. Griffiths, M. (2011) *Rethinking International Relations Theory.* New York and Basingstoke: Palgrave Macmillan.
4. Halliday, F. (1994) *Rethinking International Relations.* Basingstoke and London: Macmillan Press.
5. Jönsson, C. (2018) Classical liberal internationalism. In *International Organization and Global Governance* (ed. T. G. Weiss and R. Wilkinson), 2nd edn, pp. 109–22. Routledge.

Chapter 2: Liberalisms (and conservatism)

1. Ashford, N. (2003) *Principles for a Free Society.* Stockholm: Jarl Hjalmarson Foundation.
2. Berlin, I. (1969) *Four Essays on Liberty.* Oxford University Press.
3. Butler, E. (2015) *Classical Liberalism: A Primer.* London: Institute of Economic Affairs.
4. Butler, E. (2019) *School of Thought: 101 Great Liberal Thinkers.* London: Institute of Economic Affairs.
5. Freeden, M. (1996) *Ideologies and Political Theory: A Conceptual Approach.* Oxford: Clarendon Press.
6. Freeden, M. (2003) *Ideology: A Very Short Introduction.* Oxford University Press.
7. Kirk, R. (1985) *The Conservative Mind: From Burke to Elliot.* Washington: Regnery Publishing.
8. Mises, L. von (1996 [1949]) *Human Action: A Treatise on Economics.* San Francisco: Fox & Wilkes.
9. Nisbet, R. (1986) *Conservatism: Dream and Reality.* Milton Keynes: Open University.
10. Oakeshott, M. (1962) *Rationalism in Politics and Other Essays.* New York: Basic Books.
11. Scruton, R. (2001) *The Meaning of Conservatism.* Basingstoke: Palgrave.
12. Scruton, R. (2017) Transcript: Point of View. BBC Radio 4, 27 August.

Chapter 3: Scottish Enlightenment: David Hume and Adam Smith

1. Berry, C. J. (1997) *Social Theory of the Scottish Enlightenment.* Edinburgh University Press.
2. Fleischacker, S. (2004) *On Adam Smith's Wealth of Nations: A Philosophical Companion.* Princeton University Press.
3. Glossop, R. J. (1984) Hume and the future of the society of nations. *Hume Studies* X: 46–58.

4. Grotius, H. (2005) *The Rights of War and Peace* (3 books) (ed. R. Tuck). Indianapolis: Liberty Fund.
5. Haakonssen, K. (1981) *The Science of a Legislator. The Natural Jurisprudence of David Hume and Adam Smith.* Cambridge University Press.
6. Haakonssen, K. (2006) Introduction. The coherence of Smith's thought. In *The Cambridge Companion to Adam Smith* (ed. K. Haakonssen), pp. 1–21. Cambridge University Press.
7. Hardin, R. (2007) *David Hume: Moral and Political Theorist.* Oxford University Press.
8. Harris, J. A. (2015) *Hume: An Intellectual Biography.* Cambridge University Press.
9. Hume, D. (1932 [1727–76]) *The Letters of David Hume* (two vols) (ed. J. Y. T. Greig). Oxford University Press.
10. Hume, D. (1985 [1777]) *Essays: Moral, Political and Literary* (ed. E. F. Miller). Indianapolis: Liberty Fund.
11. Hume, D. (1998 [1751]) *An Enquiry Concerning the Principles of Morals* (ed. T. L. Beauchamp). Oxford University Press.
12. Hume, D. (2000 [1739]) *A Treatise on Human Nature* (ed. D. F. Norton and M. J. Norton). Oxford University Press.
13. Manzer, R. A. (1996) The promise of peace? Hume and Smith on the effects of commerce on war and peace. *Hume Studies* XXII: 369–82.
14. Mises, L. von (1996) *Human Action: A Treatise on Economics.* San Francisco: Fox & Wilkes.
15. Mossner, E. C. (1980) *The Life of David Hume.* Oxford: Clarendon Press.
16. Ross, I. S. (2010) *The Life of Adam Smith,* 2nd edn. Oxford University Press.
17. Smith, A. (1981 [1776]) *An Inquiry into the Nature and Causes of the Wealth of Nations* (ed. E. C. Mossner and I. S. Ross). Indianapolis: Liberty Fund.
18. Smith, A. (1982 [1759]) *The Theory of Moral Sentiments* (ed. D. D. Raphael and A. L. Macfie). Indianapolis: Liberty Fund.
19. Smith, C. (2006) *Adam Smith's Political Philosophy: The Invisible Hand and Spontaneous Order.* London and New York: Routledge.
20. Stevens, D. (1987) Smith's thoughts on the state of the contest with America, February 1778. In *Correspondence of Adam Smith*

(ed. E. C. Mossner and I. S. Ross), pp. 377–80. Indianapolis: Liberty Fund.
21. Van de Haar, E. R. (2008) David Hume and international political theory: a reappraisal. *Review of International Studies* 34: 225–42.
22. Van de Haar, E.R. (2013a) Adam Smith on empire and international relations. In *The Oxford Handbook of Adam Smith* (ed. C. J. Berry, M. P. Paganelli and C. Smith), 417–39. Oxford University Press.
23. Van de Haar, E.R. (2013b) David Hume and Adam Smith on international ethics and humanitarian intervention. In *Just and Unjust Military Intervention: European Thinkers from Vitoria to Mill* (ed. S. Recchia and J. M. Welsh), pp. 154–75. Cambridge University Press.
24. Whelan, F. G. (2004) *Hume and Machiavelli: Political Realism and Liberal Thought.* Lanham: Lexington Books.

Chapter 4: Austrian School: Ludwig von Mises and Friedrich Hayek

1. Boettke, P. J. (2019) *F. A. Hayek: Economics, Political Economy and Social Philosophy.* Basingstoke and New York: Palgrave Macmillan.
2. Butler, E. (1985) *Hayek: His Contribution to the Political and Economic Thought of Our Time.* New York: Universe Books.
3. Butler, E. (1988) *Ludwig von Mises: Fountainhead of the Modern Microeconomics Revolution.* Aldershot and Brookfield: Gower.
4. Caldwell, B. (2004) *Hayek's Challenge: An Intellectual Biography of F. A. Hayek.* University of Chicago Press.
5. Caldwell, B. and Klausinger, H. (2022) *Hayek: A Life, 1899–1950.* University of Chicago Press.
6. Dekker, E. (2016) *The Viennese Students of Civilization: The Meaning and Context of Austrian Economics Reconsidered.* Cambridge University Press.
7. Ebenstein, A. (2001) *Friedrich Hayek: A Biography.* New York and Houndmills: Palgrave Macmillan.
8. Ebenstein, A. (2003) *Hayek's Journey: The Mind of Friedrich Hayek.* New York and Houndmills: Palgrave Macmillan.

9. Feser, E. (2006) *The Cambridge Companion to Hayek.* Cambridge University Press.
10. Hayek, F. A. (1948) *Individualism and Economic Order.* University of Chicago Press.
11. Hayek, F. A. (1990) *Denationalisation of Money: The Argument Refined,* 3rd edn. London: Institute of Economic Affairs.
12. Hayek, F. A. (1994) *Hayek on Hayek: An Autobiographical Dialogue* (ed. S. Kresge and L. Wenar). University of Chicago Press.
13. Hayek, F. A. (1997) *Socialism and War: Essays, Documents, Reviews.* The Collected Works of F. A. Hayek, vol. X. University of Chicago Press.
14. Hayek, F. A. (2007) *The Road to Serfdom. Text and Documents. The Definitive Edition.* The Collected Works of F. A. Hayek, vol. II. University of Chicago Press.
15. Hayek, F. A. (2021) *Law, Legislation and Liberty. A New Statement of the Liberal Principles of Justice and Political Economy* (ed. J. Shearmur). The Collected Works of F. A. Hayek, vol. XIX. University of Chicago Press.
16. Hayek, F. A. (2022) *Essays on Liberalism and the Economy* (ed. P. Lewis). The Collected Works of F. A. Hayek, vol. XVIII. University of Chicago Press.
17. Hülsmann, J. G. (2007) *Mises: The Last Knight of Liberalism.* Auburn: Ludwig von Mises Institute.
18. Kirzner, I. M. (2001) *Ludwig von Mises: The Man and His Economics.* Wilmington: ISI Books.
19. Mises, L. von (1983) *Nation, State, and Economy: Contributions to the Politics and History of Our Time.* New York and London: Institute for Humane Studies & New York University Press.
20. Mises, L. von (1985) *Omnipotent Government: The Rise of the Total State and Total War.* Grove City: Libertarian Press.
21. Mises, L. von (1996) *Human Action: A Treatise on Economics.* San Francisco: Fox & Wilkes.
22. Mises, L. von (2000) An Eastern Democratic Union: a proposal for the establishment of a durable peace in Eastern Europe. In *Selected writings of Ludwig von Mises* (ed. R. Ebeling). Indianapolis: Liberty Fund.
23. Simon, J. (1996) *The Ultimate Resource 2.* Princeton University Press.

24. Van de Haar, E. R. (2022) Ludwig von Mises and Friedrich Hayek: federation as last resort. *Cosmos + Taxis* (10) 11+12, 104–18.

Chapter 5: Individuals: Human nature, natural and human rights

1. Berry, C. J. (1986) *Human Nature.* Basingstoke: Macmillan.
2. Coker, C. (2014) *Can War Be Eliminated?* Cambridge: Polity.
3. Donelan, M. (2007) *Honor in Foreign Policy: A History and Discussion.* New York and Basingstoke: Palgrave Macmillan.
4. Garrett, A. (2003) Anthropology: the 'Original' of human nature. In *The Cambridge Companion to the Scottish Enlightenment* (ed. A. Broadie), pp. 79–93. Cambridge University Press.
5. Hayek, F. A. (1993) *The Constitution of Liberty.* London: Routledge.
6. Hume, D. (1998) *An Enquiry Concerning the Principles of Morals.* Oxford University Press.
7. Hume, D. (1999) *An Enquiry Concerning Human Understanding.* Oxford University Press.
8. Hume, D. (2000) *A Treatise of Human Nature.* Oxford University Press.
9. Jackson, R. H. (2000) *The Global Covenant: Human Conduct in a World of States.* Oxford University Press.
10. MacMillan, M. (2020) *War: How Conflict Shaped Us.* London: Profile Books.
11. Mill, J. S. (1989) *On Liberty and Other Writings.* Cambridge University Press.
12. Mises, L. von (1985 [1927]) *Liberalism: The Classical Tradition.* Irvington-on-Hudson: The Foundation for Economic Education.
13. Mises, L. von (1996) *Human Action: A Treatise on Economics.* San Francisco: Fox & Wilkes.
14. Pinker, S. (2002) *The Blank Slate: The Modern Denial of Human Nature.* New York: Penguin Books.
15. Pinker, S. (2011) *The Better Angels of Our Nature: A History of Violence and Humanity.* London: Penguin.
16. Rosen, S. P. (2005) *War and Human Nature.* Princeton University Press.

17. Rubin, P. H. (2002) *Darwinian Politics: The Evolutionary Origin of Freedom.* New Brunswick and London: Rutgers University Press.
18. Smith, A. (1982) *The Theory of Moral Sentiments.* Indianapolis: Liberty Fund.
19. Thayer, B. A. (2004) *Darwin and International Relations: On the Evolutionary Origins of War and Ethnic Conflict.* Lexington: University Press of Kentucky.
20. United Nations (2021) Responsibility to protect (https://www.un.org/en/genocideprevention/about-responsibility-to-protect.shtml).
21. Waltz, K. (1959) *Man, the State and War: A Theoretical Analysis.* New York: Columbia University Press.
22. Wrangham, R. (2019) *The Goodness Paradox: The Strange Relationship between Virtue and Violence in Human Evolution.* New York: Vintage Books.

Chapter 6: Groups: Nations, states, sovereignty and immigration

Anderson, B. (1996) *Imagined Communities: Reflections on the Origin and Spread of Nationalism.* London and New York: Verso.

Conway, D. (2004) *In Defence of the Realm: The Place of Nations in Classical Liberalism.* Aldershot: Ashgate.

Friedman, M. (1978) What is America? In *The Economics of Freedom.* Cleveland: Standard Oil Company of Ohio.

Gellner, E. (1983) *Nations and Nationalism.* Oxford: Blackwell.

Hayek, F. A. (1978) Integrating immigrants. *The Times,* 9 March.

Hume, D. (1932 [1727–76]) *The Letters of David Hume* (two vols) (ed. J. Y. T. Greig). Oxford University Press.

Hume, D. (1985 [1777]) *Essays: Moral, Political and Literary* (ed. E. F. Miller). Indianapolis: Liberty Fund.

Jackson, R. H. (2007) *Sovereignty: Evolution of an Idea.* Cambridge: Polity Press.

Kukathas, C. (2021) *Immigration and Freedom.* Princeton University Press.

Kedourie, E. (1993) *Nationalism.* Oxford: Blackwell.

Lal, D. (2004) *In Praise of Empires: Globalization and Order.* Basingstoke and New York: Palgrave Macmillan.

Lomasky, L. E. and Tesón, F. R. (2015) *Justice at a Distance: Extending Freedom Globally*. Cambridge University Press.
Smith, A. D. (1999) *Myths and Memories of the Nation.* Oxford University Press.
Somin, I. (2020) *Free to Move: Foot Voting, Migration and Political Freedom.* Oxford University Press.
Van der Vossen, B. and Brennan, J. (2018) *In Defence of Openness: Why Global Freedom Is the Humane Solution to Global Poverty.* Oxford University Press.
Watson, A. (1982) *Diplomacy: The Dialogue between States.* London: Routledge.
Ypi, L. and Fine, S. (2016) *Migration in Political Theory: The Ethics of Movement and Membership.* Oxford University Press.

Chapter 7: Violence: Balance of power, war, military intervention

1. Booth, K. and Wheeler, N. J. (2008) *The Security Dilemma: Fear, Cooperation and Trust in World Politics.* Basingstoke and New York: Palgrave Macmillan.
2. Bull, H. (1995) *The Anarchical Society: A Study of Order in World Politics.* Basingstoke and London: Macmillan.
3. Friedman, M. (1962) *Capitalism and Freedom.* University of Chicago Press.
4. Higgs, R. (2004) *Against Leviathan: Government Power and a Free Society.* Oakland: The Independent Institute.
5. Higgs, R. (2005) *Resurgence of the Warfare State: The Crisis Since 9/11.* Oakland: The Independent Institute.
6. Hume, D. (1987) *Essays: Moral, Political, and Literary.* Indianapolis: Liberty Fund.
7. Little, R. (2007) *The Balance of Power in International Relations: Metaphors, Myths and Models.* Cambridge University Press.
8. Reed, C. and Ryall, D. (2007) *The Price of Peace: Just War in the Twenty-First Century.* Cambridge University Press.
9. Rengger, N. (2013) *Just War and International Order: The Uncivil Conditions in World Politics.* Cambridge University Press.
10. Rengger, N. (2017) *The Anti-Pelagian Imagination in Political Theory and International Relations.* London and New York: Routledge.

11. Sobek, D. (2009) *The Causes of War.* Cambridge: Polity.
12. Suganami, H. (1996) *On the Causes of War.* Oxford: Clarendon Press.
13. United Nations (2021) Responsibility to protect (https://www.un.org/en/genocideprevention/about-responsibility-to-protect.shtml).
14. Van de Haar, E. R. (2011) Hayekian spontaneous order and the international balance of power. *Independent Review* 16: 101–18.
15. Van de Haar, E. R. (2013b) David Hume and Adam Smith on international ethics and humanitarian intervention. In *Just and Unjust Military Intervention: European Thinkers from Vitoria to Mill* (ed. S. Recchia and J. M. Welsh), pp. 154–75. Cambridge University Press.
16. Walzer, M. (1992) *Just and Unjust Wars: A Moral Argument with Historical Illustrations.* New York: Basic Books.
17. Walzer, M. (2005) *Arguing about War.* New Haven and London: Yale University Press.

Chapter 8: Rules: International law and international organisation

1. Besson, S. and Tasioulas, J. (2010) *The Philosophy of International Law.* Oxford University Press.
2. Equality and Human Rights Commission (2017) What is the European Convention on Human Rights? (https://www.equalityhumanrights.com/en/what-european-convention-human-rights).
3. Mises, L. von (1985) *Liberalism: The Classical Tradition.* Irvington-on-Hudson: Foundation for Economic Education.
4. Nabulsi, K. (2005) *Traditions of War: Occupation, Resistance, and the Law.* Oxford University Press.
5. Simmons, B. A. and Steinberg, R. H. (2006) *International Law and International Relations.* Cambridge: IO Foundation / Cambridge University Press.
6. Tuck, R. (1999) *The Rights of War and Peace: Political Thought and the International Order – From Grotius to Kant.* Oxford University Press.

Chapter 9: Economics: Trade, globalisation and development aid

1. Banerjee, A. V. and Duflo, E. (2011) *Poor Economics: Barefoot Hedge-fund Managers, DIY Doctors and the Surprising Truth about Life on Less than 1$ a Day.* London: Penguin.
2. Bauer, P. T. (1971) *Dissent on Development: Studies and Debates in Development Economics.* London: Weidenfeld and Nicolson.
3. Bauer, P. T. and Yamey, B. S. (1957) *The Economics of Under-Developed Countries.* Cambridge University Press.
4. Bhagwati, J. (2004) *In Defence of Globalization.* Oxford University Press.
5. Butler, E. (2021) *Introduction to Trade and Globalisation.* London: Institute of Economic Affairs.
6. Coker, C. (2014) *Can War Be Eliminated?* Cambridge: Polity.
7. Easterly, W. (2002) *The Elusive Quest for Growth: Economist's Adventures and Misadventures in the Tropics.* Cambridge, MA and London: The MIT Press.
8. Easterly, W. (2013) *The Tyranny of Experts: Economists, Dictators and the Forgotten Rights of the Poor.* New York: Basic Books.
9. Germann, J. (2018) Marxism. In *International Organization and Global Governance* (ed. T. G. Weiss and R. Wilkinson), pp. 170–79. Routledge.
10. Hammarlund, P. A. (2005) *Liberal Internationalism and the Decline of the State: The Thought of Richard Cobden, David Mitrany and Kenichi Ohmae.* Basingstoke and New York: Palgrave Macmillan.
11. Hoekman, B. and Kostecki, M. (2009) *The Political Economy of the World Trading System: The WTO and Beyond.* Oxford University Press.
12. Hont, I. (2005) *Jealousy of Trade: International Competition and the Nation-State in Historical Perspective.* Cambridge and London: The Belknap Press of Harvard University Press.
13. Hume, D. (1987) *Essays: Moral, Political, and Literary.* Indianapolis: Liberty Fund.
14. Irwin, D. A. (1996) *Against the Tide: An Intellectual History of Free Trade.* Princeton University Press.
15. Irwin, D. A. (2017) *Clashing over Commerce: A History of US Trade Policy.* The University of Chicago Press.

16. Lal, D. (2002) *The Poverty of 'Development Economics'*. London: Institute of Economic Affairs.
17. List, F. (1841) *The National System of Political Economy* (trans. S. Lloyd). London: Longmans, Green and Co. (See *The National System of Political Economy,* Online Library of Liberty (libertyfund.org).
18. Moyo, D. (2009) *Dead Aid: Why Aid Is Not Working and How There Is Another Way for Africa.* London: Penguin.
19. Norberg, J. (2001) *In Defence of Global Capitalism.* Stockholm: Timbro.
20. Norberg, J. (2017) *Progress: Ten Reasons to Look Forward to the Future.* London: One World.
21. Palmer, T. and Warner, M. (2022) *Development with Dignity: Self-Determination, Localization and the End to Poverty.* New York: Routledge.
22. Panagariya, A. (2019) *Free Trade and Prosperity: How Openness Helps Developing Countries Grow Richer and Combat Poverty.* Oxford University Press.
23. Ricardo, D. (2002 [1817]) *The Principles of Political Economy and Taxation.* London: Empiricus Books.
24. Rosling, H. (with O. Rosling and A. Rossling Rönnlund) (2018) *Factfulness: Ten Reasons Why We Are Wrong about the World – and Why Things Are Better Than You Think.* London: Sceptre.
25. Sally, R. (1998) *Classical Liberalism and International Economic Order: Studies in Theory and Intellectual History.* London: Routledge.
26. Sally, R. (2008) *Trade Policy, New Century: The WTO, FTAs and Asia Rising*. London: Institute of Economic Affairs.
27. Smith, A. (1981) *An Inquiry into the Nature and Causes of the Wealth of Nations.* Indianapolis: Liberty Fund.
28. Suganami, H. (1996) *On the Causes of War.* Oxford: Clarendon Press.
29. Van de Haar, E. R. (2010) The liberal divide over trade, war and peace. *International Relations* 24: 132–54.
30. Van de Haar, E. R. (2011) Philippine trade policy and the Japan–Philippines Economic Partnership Agreement (JPEPA). *Contemporary Southeast Asia* 33: 113–39.
31. Van de Haar, E. R. (2020a) Free trade does not foster peace. *Economic Affairs* 40: 281–86.

32. Van de Haar, E. R. (2020b) Rejoinder. *Economic Affairs* 40: 454–56.
33. Wolf, M. (2005) *Why Globalization Works.* New Haven and London: Yale University Press.

Chapter 10: Liberal IR theories

1. Ashworth, L. M. (1999) *Creating International Studies: Angell, Mitrany and the Liberal Tradition.* Aldershot: Ashgate.
2. Baldwin, D. A. (1993) Neoliberalism, neorealism, and world politics. In *Neorealism and Neoliberalism: The Contemporary Debate* (ed. D. A. Baldwin), pp. 3–25. New York: Columbia University Press.
3. Barbieri, K. (2005) *The Liberal Illusion: Does Trade Promote Peace?* Ann Arbor: The University of Michigan Press.
4. Bernstein, S. and Pauly, L. W. (2007) *Global Liberalism and Political Order: Toward a New Grand Compromise?* Albany: State University of New York Press.
5. Brown, M. E., Lynn-Jones, S. M. and Miller, S. E. (eds) (1996) *Debating the Democratic Peace.* Cambridge, MA: MIT Press.
6. Burchill, S. (2013) Liberalism. In *Theories of International Relations* (ed. S. Burchill and A. Linklater), pp. 57–87. Basingstoke and New York: Palgrave Macmillan.
7. Copeland, D. C. (2015) *Economic Interdependence and War.* Princeton University Press.
8. Doyle, M. W. (1986) Liberalism and world politics. *American Political Science Review* 80: 1151–69.
9. Doyle, M. W. (1996) Kant, liberal legacies and foreign affairs. In *Debating the Democratic Peace* (ed. M. E. Brown, S. M. Lynn-Jones and S. E. Miller), pp. 3–57. Cambridge, MA: MIT Press.
10. Doyle, M. W. (1997) *Ways of War and Peace: Realism, Liberalism and Socialism.* New York and London: W. W. Norton & Company.
11. Dunne, T. (2005) Liberalism. In *The Globalization of World Politics: An Introduction to International Relations* (ed. J. Baylis and S. Smith), pp. 185–201. Oxford University Press.
12. Gartzke, E. (2007) The capitalist peace. *American Journal of Political Science* 51(1): 166–91.

13. Goddard, S. E. and Krebs, R. R. (2021) Legitimating primacy after the Cold War: how liberal talk matters to US foreign policy. In *Before and After the Fall: World Politics and the End of the Cold War* (ed. N. P. Monteiro and F. Bartel), pp. 132–50. Cambridge University Press.
14. Griffiths, M. (2011) *Rethinking International Relations Theory.* New York and Basingstoke: Palgrave Macmillan.
15. Hammarlund, P. A. (2005) *Liberal Internationalism and the Decline of the State: The Thought of Richard Cobden, David Mitrany and Kenichi Ohmae.* Houndmills and New York: Palgrave Macmillan.
16. Jackson, R. H. and Sørensen, G. (2003) *Introduction to International Relations: Theories and Approaches.* Oxford University Press.
17. Jahn, B. (2013) *Liberal Internationalism: Theory, History, Practice.* Basingstoke: Palgrave Macmillan.
18. Jørgensen, K. E. (2018) *International Relations Theory: A New Introduction.* London: Palgrave.
19. Jørgensen, K. E. (2021) *The Liberal International Theory Tradition in Europe.* Basingstoke: Palgrave Macmillan.
20. Keohane, R. O. (1990) International liberalism reconsidered. In *The Economic Limits to Modern Politics* (ed. J. Dunn), pp. 165–94. Cambridge University Press.
21. Keohane, R. O. (2012) Twenty years of institutional liberalism. *International Relations* 26: 125–38.
22. Keohane, R. O. and Nye, J. N. (1989) *Power and Interdependence.* Cambridge, MA: HarperCollins.
23. Lang, A. F. (2015) *International Political Theory: An Introduction.* New York and Basingstoke: Palgrave.
24. MacMillan, J. (1998) *On Liberal Peace: Democracy, War, and the International Order.* London: I. B. Tauris Publishers.
25. Maersheimer, J. J. (2018) *The Great Delusion: Liberal Dreams and International Realities.* New Haven and London: Yale University Press.
26. Mansfield, E. D. (1994) *Power, Trade, and War.* Princeton University Press.
27. Mansfield, E. D. and Pollins, B. M. (eds) (2003) *Economic Interdependence and International Conflict: New Perspectives on*

an Enduring Debate. Ann Arbor, MI: University of Michigan Press.

28. Mansfield, E. D. and Snyder, J. (2005) *Electing to Fight: Why Emerging Democracies Go to War.* Cambridge and London: MIT Press.
29. Martin, L. L. (2007) Neoliberalism. In *International Relations Theories: Discipline and Diversity* (ed. T. Dunne, M. Kurki and S. Smith), pp. 109–26. Oxford University Press.
30. McDonald, P. J. (2009) *The Invisible Hand of Peace: Capitalism, the War Machine and International Relations Theory.* Cambridge University Press.
31. Molloy, S. (2017) *Kant's International Relations: The Political Theology of Perpetual Peace.* Ann Arbor, MI: University of Michigan Press.
32. Nye, J. N. (1988) Neorealism and neoliberalism. *World Politics* XL: 235–51.
33. Owen, J. M. (1996) How liberalism produces democratic peace. In *Debating the Democratic Peace* (ed. M. E. Brown, S. M. Lynn-Jones and S. E. Miller), pp. 116–54. Cambridge, MA: MIT Press.
34. Owen, J. M. (1997) *Liberal Peace, Liberal War: American Politics and International Security.* Ithaca, NY: Cornell University Press.
35. Panke, D. and Risse, T. (2007) Liberalism. In *International Relations Theories: Discipline and Diversity* (ed. T. Dunne, M. Kurki and S. Smith), pp. 89–108. Oxford University Press.
36. Rawls, J. (1999) *A Theory of Justice,* revised edn. Oxford University Press.
37. Rawls, J. (2002) *The Law of Peoples, with 'The Idea of Public Reason Revisited'.* Cambridge and London: Harvard University Press.
38. Rengger, N. (2013) Realism tamed or liberalism betrayed? Dystopic liberalism and the international order. In *After Liberalism? The Future of Liberalism in International Relations* (ed. R. Friedman, K. Oskanian and R. Pacheco Pardo), pp. 51–66. London: Palgrave Macmillan.
39. Richardson, J. L. (2001) *Contending Liberalisms in World Politics: Ideology and Power.* Boulder, CO: Lynne Rienner.

40. Ruggie, J. G. (1982) International regimes, transactions, and change: embedded liberalism in the postwar economic order. *International Organization* 36: 379–415.
41. Schneider, G. and Gleditsch, P. (eds) (2013) *Assessing the Capitalist Peace.* London: Routledge.
42. Sinha, A. (2017) John J. Mearsheimer on 'Liberal Ideals and International Realities'. Yale MacMillan Centre, 30 November (https://macmillan.yale.edu/news/john-j-mearsheimer-liberal-ideals-and-international-realities).
43. Stein, A. R. (2008) Neoliberal institutionalism. In *The Oxford Handbook of International Relations* (ed. C. Reus-Smit and D. Snidal), pp. 201–21.
44. Van de Haar, E. R. (2021) Classical liberalism and IR theory. In *The Liberal International Theory Tradition in Europe* (ed. K. E. Jørgensen), pp. 119–32. New York and Basingstoke: Palgrave Macmillan.
45. Wilson, W. (1918) *The Fourteen Points.* National WWI Museum and Memorial (theworldwar.org).
46. Young, O. R. (1989) *International Cooperation: Building Regimes for Natural Resources and the Environment.* Ithaca and London: Cornell University Press.
47. Zacher, M. W. and Matthew, R. A. (1995) Liberal international theory: common threads, divergent strands. In *Controversies in International Relations Theory: Realism and the Neoliberal Challenge* (ed. C. W. Kegley Jr), pp. 107–50. New York: St. Martin's Press.

Chapter 11: Classical liberalism, IR theory and foreign policy

1. Bull, H. (1966) The Grotian conception of international society. In *Diplomatic Investigations. Essays in the Theory of International Politics* (ed. H. Butterfield and M. Wight), pp. 51–73. London: George Allen & Unwin.
2. Bull, H. (1977) *The Anarchical Society: A Study of Order in World Politics.* Basingstoke and London: Macmillan.
3. Bull, H. (1990) The importance of Grotius in the study of international relations. In *Hugo Grotius and International Relations* (ed. H. Bull, B. Kingsbury and A. Roberts), pp. 65–94. Oxford: Clarendon Press.

4. Buzan, B. (2004) *From International to World Society? English School Theory and the Social Structure of Globalisation.* Cambridge University Press.
5. Buzan, B. (2014) *An Introduction to the English School of International Relations: A Societal Approach.* Cambridge: Polity Press.
6. Hill, C. (2003) *The Changing Politics of Foreign Policy.* Basingstoke and New York: Palgrave Macmillan.
7. Hume, D. (1998) *An Enquiry Concerning the Principles of Morals.* Oxford University Press.
8. Linklater, A. and Suganami, H. (2006) *The English School of International Relations: A Contemporary Reassessment.* Cambridge University Press.
9. Van de Haar, E. R. (2008) David Hume and international political theory: a reappraisal. *Review of International Studies* 34(2): 225–42.
10. Van de Haar, E. R. (2021) Classical liberalism and IR theory. In *The Liberal International Theory Tradition in Europe* (ed. K. E. Jørgensen), pp. 119–32. New York and Basingstoke: Palgrave Macmillan.
11. Waltz, K. N. (2010) *Theory of International Politics.* Longgrove: Waveland Press.
12. Whelan, F. G. (2004) *Hume and Machiavelli: Political Realism and Liberal Thought.* Lanham and Oxford: Lexington.
13. Wight, M. (1991) *International Theory: The Three Traditions* (ed. G. Wight and B. Porter). London: Leicester University Press for the Royal Institute of International Affairs.

Chapter 12: Libertarians and IR

1. Block, W. (2003) National defense and the theory of externalities, public goods, and clubs. In *The Myth of National Defense: Essays in the Theory and History of Security Production* (ed. H.-H. Hoppe), pp. 301–35. Auburn: Ludwig von Mises Institute.
2. Bresiger, G. (1997) Laissez faire and Little Englanderism: the rise, fall, rise and fall of the Manchester School. *Journal of Libertarian Studies* 13: 45–79.

3. Carpenter, T. G. (ed.) (1989) *Collective Defense or Strategic Independence? Alternative Strategies for the Future*. Washington, DC, and Lanham: Cato Institute and Lexington Books.
4. Carpenter, T. G. (1995) Toward strategic independence: protecting vital American interests. *Brown Journal of World Affairs* 2(2): 7–13.
5. Carpenter, T. G. (2002) *Peace and Freedom: Foreign Policy for a Constitutional Republic.* Washington, DC: Cato Institute.
6. Cobden, R. (1878) *The Political Writings of Richard Cobden.* London: William Ridgway.
7. De Molinari, G. (1849) The production of security. *The Mises Institute.*
8. Denson, J. V. (2003) War and American freedom. In *The Costs of War: America's Pyrrhic Victories* (ed. J. V. Denson). New Brunswick and London: Transaction Publishers.
9. Ebeling, R. M. (2003) Classical liberalism in the twenty-first century: war and peace. In *Liberty, Security, and the War on Terrorism* (ed. R. M. Ebeling and J. G. Hornberger). Fairfax: The Future of Freedom Foundation.
10. Ebeling, R. M. and Hornberger, J. G. (eds) (1995) *The Case for Free Trade and Open Immigration.* Fairfax: The Future of Freedom Foundation.
11. Ebeling, R. M. and Hornberger, J. G. (eds) (1996) *The Failure of America's Foreign Wars.* Fairfax: The Future of Freedom Foundation.
12. Ebeling, R. M. and Hornberger, J. G. (eds) (2003) *Liberty, Security, and the War on Terrorism.* Fairfax: The Future of Freedom Foundation.
13. Eland, I. (2004) *The Empire Has No Clothes: U.S. Foreign Policy Exposed.* Oakland: The Independent Institute.
14. Francis, M. (2007) *Herbert Spencer and the Invention of Modern Life.* Ithaca, NY: Cornell University Press.
15. Gotthelf, A. and Salmieri, G. (eds) (2016) *A Companion to Ayn Rand.* Chichester: Wiley Blackwell.
16. Grampp, W. D. (1960) *The Manchester School of Economics.* Stanford and London: Stanford University Press and Oxford University Press.
17. Gray, T. S. (1996) *The Political Philosophy of Herbert Spencer: Individualism and Organicism.* Aldershot: Avebury.

18. Hammarlund, P. (2005) *Liberal Internationalism and the Decline of the State: The Thought of Richard Cobden, David Mitrany, and Kenichi Ohmae.* Basingstoke: Palgrave Macmillan.
19. Higgs, R. (2005) *Resurgence of the Warfare State: The Crisis Since 9/11.* Oakland: The Independent Institute.
20. Higgs, R. (2006) *Depression, War, and Cold War: Studies in Political Economy.* Oxford University Press.
21. Hirst, F. W. (ed.) (1968) *Free Trade and Other Fundamental Doctrines of the Manchester School.* New York: Augustus M. Kelley Publishers.
22. Hoppe, H.-H. (2003a) Government and the private production of defense. In *The Myth of National Defense: Essays in the Theory and History of Security Production* (ed. H.-H. Hoppe). Auburn: Ludwig von Mises Institute.
23. Hoppe, H.-H. (ed.) (2003b) *The Myth of National Defense: Essays on the Theory and History of Security Production.* Auburn: Ludwig von Mises Institute.
24. Howe, A. and Morgan, S. (eds) (2006) *Rethinking Nineteenth-Century Liberalism: Richard Cobden Bicentenary Essays.* Aldershot: Ashgate.
25. Journo, E. (ed.) (2009) *Winning the Unwinnable War: America's Self-Crippled Response to Islamic Totalitarianism.* Lanham: Lexington Books.
26. Lomasky, L. E. and Tesón, F. R. (2015) *Justice at a Distance: Extending Freedom Globally.* Cambridge University Press.
27. Prebble, C. A. (2019) *Peace, War, and Liberty: Understanding US Foreign Policy.* Washington, DC: Libertarianism.org.
28. Rand, A. (1964) *The Virtue of Selfishness: A New Concept of Egoism.* New York: Meridian.
29. Rockwell, L. H. (2003) *Speaking of Liberty.* Auburn: Ludwig von Mises Institute.
30. Rothbard, M. N. (2000) *Egalitarianism as a Revolt against Nature, and Other Essays.* Auburn: Ludwig von Mises Institute.
31. Rothbard, M. N. (2002) *The Ethics of Liberty.* New York and London: New York University Press.
32. Rothbard, M. N. (2003) America's two just wars: 1775 and 1861. In *The Costs of War: America's Pyrrhic Victories* (ed. J. V. Denson). New Brunswick and London: Transaction Publishers.

33. Rothbard, M. N. (2004) *Man, Economy, and State: A Treatise on Economic Principles, with Power and Market – Government and the Economy.* Auburn: Ludwig von Mises Institute.
34. Spencer, H. (1978) *The Principles of Ethics* (two vols). Indianapolis: Liberty Fund.
35. Spencer, H. (1982) *The Man versus the State: With Six Essays on Government, Society and Freedom.* Indianapolis: Liberty Fund.
36. Trentmann, F. (2006) The resurrection and decomposition of Cobden in Britain and the West: an essay in the politics of reputation. In *Rethinking Nineteenth-Century Liberalism: Richard Cobden Bicentenary Essays* (ed. A. Howe and S. Morgan). Aldershot: Ashgate.
37. Van de Haar, E. R. (2010) The liberal divide over trade, peace and war. *International Relations* 24(2): 132–54.
38. Van De Haar, E. R. (2019) Fostering liberty in international relations theory: the case of Ayn Rand. *International Politics* 56: 1–16.
39. Van De Haar, E. R. (2020a) Free trade does not foster peace. *Economic Affairs* 40: 281–86.
40. Weinstein, D. (1998) *Equal Freedom and Utility: Herbert Spencer's Liberal Utilitarianism.* Cambridge University Press.

Urdu Translation of *Edwin van de Haar's*

Human Nature & World Affairs

An Introduction to Classical Liberalism and International Relations Theory

دنیا کو سمجھنے کے لیے صرف واقعات کا مطالعہ کافی نہیں؛ ان خیالات، اقدار اور انسانی محرکات کو سمجھنا بھی ضروری ہے جو ان واقعات کو جنم دیتے ہیں۔ انسانی فطرت اور عالمی امور اسی بنیادی سوال کا ایک گہرا اور فکر انگیز مطالعہ پیش کرتی ہے۔ یہ کتاب انسانی فطرت، آزادی، ریاست، جنگ، امن، تجارت اور بین الاقوامی تعاون کے باہمی تعلق کو کلاسیکی لبرل فکر کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔

نیشنل اِنفلوونسرز کا یقین ہے کہ ایک آزاد، پُرامن اور خوش حال معاشرے کی تشکیل کے لیے فکری آزادی اور سنجیدہ علمی مکالمہ ناگزیر ہیں۔ اسی مقصد کے تحت ہم اہم عالمی اور فکری مباحث کو اردو زبان میں متعارف کرانے کی کوشش کر رہے ہیں، تاکہ پاکستان کے طلبہ، نوجوان، محققین، پالیسی ساز اور عام قارئین عالمی معاملات اور انسانی آزادی سے متعلق بنیادی نظریات تک براہِ راست رسائی حاصل کر سکیں۔

یہ ترجمہ صرف ایک کتاب کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی کوشش نہیں، بلکہ خیالات کے ایک اہم علمی مکالمے کو وسیع تر اردو دنیا تک پہنچانے کی ایک کاوش ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب قارئین کو عالمی سیاست اور بین الاقوامی تعلقات کو محض طاقت اور مفادات کے تناظر میں نہیں، بلکہ انسانی فطرت، آزادی اور سماجی نظم کے بنیادی سوالات کی روشنی میں بھی دیکھنے کا ایک نیا زاویہ فراہم کرے گی۔

محمد سلیمان

صدر، نیشنل اِنفلوونسرز

ISBN 978-627-7608-09-5

9 786277 608095

Whetstone Freedom Fund · iea Institute of Economic Affairs · National Influencers